بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فضائل القرآن

نمبر ۵

قرآن کریم کی کُتب سابقہ پر فضیلت کی نویں دلیل

انبیاء سابقین کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق پیشگوئیاں

اور

قرآن کریم کی آٹھ اصولی اصلاحات

فرمودہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء بمقام قادیان

تشہد و تعوّذ کے بعد حضور نے سورۂ اعراف کی مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کی:-

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ (اعراف آیت ۱۵۸/۱۵۹)

اس کے بعد فرمایا :-

کل کی تقریروں کے بعد میرا گلا شام تک تو اچھا تھا لیکن رات کو ملاقاتوں کے بعد گلا بیٹھ گیا۔ ۱۲ بجے کے قریب سردی لگنے کی وجہ سے بات کرنے میں تکلیف شروع ہوئی اور ایک بجے رات جب ملاقاتیں ختم ہوئیں تو گلا بہت کچھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے گو میں اس وقت اونچی آواز سے نہیں بول سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ تھوڑی دیر میں ہی حلق گرم ہونے کے بعد آواز بلند ہو جائیگی۔ شروع میں ممکن ہے کہ تقریر کے بعض حصے احباب تک نہ پہنچ سکیں لیکن احباب کو صبر سے کام لینا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید رکھنی چاہیئے کہ جبکہ وہ دُور دُور سے کلماتِ حق سُننے کے لئے یہاں آئے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس سے امید رکھتے ہوئے میں حق کہنے کیلئے کھڑا ہوا ہوں تو ہم دونوں پر وہ فضل فرمائیگا اور مجھے کہنے اور آپ لوگوں کو سُننے کی توفیق عطا فرمائیگا۔

دینی مجالس کی اہمیت

مجھے افسوس ہے کہ بعض دوست گو وہ نہایت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ باوجود سمجھانے کے پھر بھی مجلس سے اُٹھ کر چلے جاتے اور باہر پھرتے رہتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر جماعت میں کچھ نمائشی ممبر بھی ہوتے ہیں اور وہ مجلس میں اپنی نمائش کرنے کے بعد جگہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے کہ ایسے نمائشی لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی تھے۔ جب مجلس منعقد ہوتی تو وہ بھی آجاتے۔ گفتگو شروع ہونے سے پہلے ہر ایک پر نظر پڑتی ہے۔ صحابہؓ

اُن کو دیکھتے لیکن جب کام شروع ہو جاتا تو آنکھ بچا کر کھسکنے لگتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے متعلق فرماتا ہے۔ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا[1] ۔ وہ لوگ جو تم میں سے نظر بچا کر مجلس سے بھاگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُنکو خوب جانتا ہے۔ ایسے نمائشی ممبر یہاں بھی ہوتے ہونگے۔ مگر کئی لوگ ایسے ہیں جو اِس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اور وہ جانتے نہیں کہ ان کا یہ فعل کیسا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دفعہ تقریر کر رہے تھے کہ آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ اس مجلس میں ایک شخص آیا۔ اُس نے دیکھا کہ مجلس بھری ہوئی ہے۔ اُس تک آواز مشکل سے پہنچتی تھی۔ مگر اُس نے یہ خیال کر کے کہ ذکر الٰہی ہو رہا ہے یہاں سے جانا نہیں چاہیئے۔ شرم کر کے بیٹھ گیا۔ خدا تعالیٰ نے کہا۔ مَیں بھی اس کے گناہوں کے متعلق شرم کرونگا اور اُن کے بارے میں گرفت نہیں کرونگا پھر ایک اور شخص آیا۔ اُس نے بھی دیکھا کہ مجلس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں۔ مگر وہ اِدھر اُدھر تلاش کر کے ایسی جگہ بیٹھ گیا۔ جہاں سے آواز سُن سکے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا جس طرح یہ شخص کوشش کر کے آگے بڑھا مَیں بھی اِسے اپنے قرب میں جگہ دونگا۔ پھر ایک تیسرے شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی۔ وہ آیا مگر یہ دیکھکر کہ آواز نہیں پہنچتی واپس چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ جس طرح یہ شخص ذکر الٰہی کی مجلس سے واپس چلا گیا اِسی طرح مَیں بھی اس سے مُنہ پھیر لونگا اور رحمت کے دروازے اس کے لئے نہیں کھولونگا۔

غرض ذکر الٰہی کی مجلس کے آداب ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے دل میں مرض تھا اُن کا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی علاج نہ کر سکے۔ یہی فرمایا کہ ایسا شخص آیا اور چلا گیا۔ جب ایسا بیمار دل رکھنے والے کا علاج رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے نہ ہو سکا تو ہم سے کس طرح ہو سکتا ہے۔ مگر کئی لوگ بے خبری کی حالت میں مارے جاتے ہیں۔ انہیں اِس بات کا علم نہیں ہوتا کہ جو کام وہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب ذکر الٰہی کی مجلس منعقد ہوتی ہے تو اُس کے خاتمہ تک فرشتے

[1] النور: ۶۴

نازل ہوتے اور خدا تعالیٰ کی رحمت لاتے رہتے ہیں۔ ذکر الٰہی کی مجلس ایسی مجلس ہوتی ہے جیسا کہ بادشاہ کا دربار ہو۔ اگر بادشاہ کے دربار سے اُٹھ کر جانے والا مجرم ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کے دربار سے اُٹھ کر چلا جانے والا کیوں مجرم نہیں ہوگا۔ اِسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجلس میں سب لوگ بیٹھے رہیں۔ اگر کسی کو ضرورت کی وجہ سے اٹھنا پڑے تو اجازت لیکر جائے۔ اس مجلس میں جو ۱۵-۱۶ ہزار افراد پر مشتمل ہے لوگوں کا اجازت لینا تو مشکل ہے۔ مگر مَیں یہ ضرور کہتا ہوں کہ جو لوگ ضرورتاً باہر جائیں وہ ضرورت پوری کرکے جلد واپس آجائیں اور وہ سمجھیں کہ اُن کا اِس مجلس میں بیٹھنا فضول نہیں۔ اوّل تو جو بات بھی کان میں پڑے گی اگر مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑ لیا جائیگا۔ تو وہ نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو بھی اس مجلس میں بیٹھنا نیکی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر احمدی قرآن کریم کا ترجمہ جانتا ہو۔ مگر بہت ہیں جو نہیں جانتے۔ لیکن جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو انہیں ثواب ہوتا ہے۔ اِسی طرح اس مجلس میں خواہ کسی کو آواز نہ آئے اور تقریر کا مطلب نہ سمجھ سکے تب بھی بیٹھنے پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اِس کے بعد مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا آج کا مضمون اس گذشتہ مضمون کی ایک کڑی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے مَیں چار سال سے متواتر بیان کرتا آرہا ہوں یعنی آج کا مضمون فضائل القرآن کی پانچویں قسط ہے۔ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو ہستی باری تعالیٰ کے مضمون کی طرح اتنی وسعت حاصل ہوتی ہے کہ اُن کو خواہ کتنی بار بیان کیا جائے اُن میں تکرار پیدا نہیں ہوسکتا۔ فضائل القرآن کے مضمون میں بھی تکرار نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں اتنے معارف ہیں کہ چاہے ساری دنیا مِل کر قیامت تک انہیں بیان کرتی رہے وہ کبھی ختم نہ ہونگے۔

اِس موضوع پر گذشتہ سالوں میں جو لیکچر دیئے گئے ہیں۔ وہ شائع نہیں ہو سکے اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا منشا ہے کہ مکمل ایک جلد کی شکل دے کر اِن کو شائع

کیا جائے تاکہ قرآن کریم اور دوسرے مذاہب کی الہامی کُتب کا مقابلہ کرتے وقت جماعت کے لوگوں کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے اور براہین احمدیہ کو مکمل کرنے کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو منشا تھا اس کے پورا کرنے میں ہم بھی حصّہ لے سکیں۔

علمی تقاریر کا فائدہ

بعض دوستوں نے کہا ہے کہ آپ کا سالانہ جلسہ کا علمی لیکچر ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ بہت سے لوگ صرف برکت حاصل کرنے کے لئے لیکچر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اگر وہ لوگ برکت حاصل کرنے کیلئے بیٹھے رہتے ہیں اور خدا تعالیٰ انہیں برکت دے دیتا ہے تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ یہی غرض تو یہاں آنے کی ہوتی ہے۔ جب وہ مل گئی چاہے لیکچر سمجھ کر اور چاہے نہ سمجھتے ہوئے مقصد تو حاصل ہو گیا۔ پس اس پر کسی کو گلہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ دیکھو اگر خدا تعالیٰ کسی گناہگار کو باز پرس کئے بغیر جنت میں داخل کر دے تو کیا وہ جنّت میں داخل ہونے سے انکار کر دیگا۔ وہ تو فوراً آگے بڑھ کر جنّت میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح جسے لیکچر میں بیٹھے رہنے سے برکت حاصل ہو جائے اسے اس بات کا کیا شکوہ ہو سکتا ہے کہ لیکچر میں جو کچھ بتایا گیا ہے اُسے وہ سمجھ نہیں سکا۔ مگر میں سمجھتا ہوں یہ بات ہے بھی غلط۔ اسلئے کہ ہماری جماعت کے دوستوں کے دماغ خدا تعالیٰ نے ایسے اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیئے ہیں کہ اپنے ایک دوست کی طرف سے یہ بات سُن کر کہ بعض لوگ لیکچر کو سمجھ نہیں سکتے مجھے بہت تعجب ہُوا۔ پچھلے دنوں مرکزی خلافت کمیٹی کے آرگن روزانہ اخبار "خلافت" نے ایک کانگریسی ہندو لیڈر کے یہ کہنے پر کہ "مسلمان جاہل پسماندہ اور ناکافی تعلیمیافتہ ہیں۔ اور ان کو کنٹرول کرنا آسان نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور ناخواندہ فرقہ کے ہاتھ میں دی جانے لگی ہے۔" لکھا تھا کہ "اگر قادیان جیسے قصبہ کا ٹانگہ والا خالصہ اور دیانند کالج کے گریجوئیٹوں کے منہ بند نہ کر دے تو ہمارا ذمہ۔ پھر مسلمان کبھی صوبہ کی آزادی طلب نہیں کریں گے۔" اگر مخالفین کے نزدیک قادیان کے ٹانگہ چلانے والے کو اتنی قابلیت

حاصل ہے تو پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اپنوں میں سے کوئی یہ کہے کہ احمدی میرے لیکچر کو سمجھ نہیں سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ تو لیکچر کو بخوبی سمجھتے ہیں مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بعض احمدی لیکچر کو نہیں سمجھ سکتے وہ اپنے بھائیوں کو نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اپنے متعلق تو حسن ظنی سے کام لیا کہ وہ خود لیکچر کو سمجھ سکتے ہیں لیکن دوسروں کے متعلق حسن ظنی اختیار نہ کی اور کہہ دیا کہ وہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ انبیاء پر ایمان لانے والے خواہ مروّجہ علوم سے ناواقف ہوں۔ دین کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں آسمانی علوم ملا کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ میں اسلام کے تازہ معجزات لایا ہوں۔ اور اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہوں۔ مگر دوسرے لوگ قصے کہانیاں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی جماعت کو روحانی علوم کے متعلق مشاہدہ حاصل ہے اور آپ پر ایمان لانے کے دن ہی ہر احمدی کو نیا علم حاصل ہو جاتا ہے اور احمدیوں کو خدا تعالیٰ ہر قسم کے اعتراضات کے جواب آپ سمجھا دیتا ہے۔ اگر کوئی تمسخر کرتا ہے تو اُسے بھی جواب مل جاتا ہے۔ مولوی غلام رسول صاحب راجیکی نے سُنایا کہ وہ ایک جگہ مباحثہ کیلئے گئے مباحثہ کے متعلق مخالف مولوی سے گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک احمدی کو رقعہ دیکر اُن مولوی صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ مولوی صاحب نے انہیں بے علم سمجھ کر چاہا کہ اُسے قابو میں لے آئیں۔ اِس خیال سے اس احمدی کو کہا۔ دیکھو قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق رَافِعُكَ اِلَيَّ لکھا ہے یعنی اوپر اٹھانا اس لئے وہ فوت ہو ہی نہیں سکتے۔ اس احمدی نے کہا۔ رافعك کی ف کے نیچے کیا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ زیر۔ احمدی نے کہا رافعك اوپر تو لے جاتا مگر یہ زیر اوپر نہیں جانے دیتی۔ اِس پر مولوی صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ غرض جس رنگ میں دشمن چلتا ہے۔ اُسی رنگ میں ناکام کرنے کیلئے خدا تعالیٰ احمدیوں کو سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ ظاہری علوم سے بالکل ناواقف احمدی ایسے ایسے لطیف جواب دیتے ہیں کہ مخالف کے لئے خاموش ہوئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں آپؑ کا ایک خادم پیراں دِتّا نام ہوا کرتا تھا۔ بہت معمولی سمجھ کا انسان تھا۔ مگر باوجود اس کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس

رہنے کا اُس پر ایسا اثر تھا کہ ایک دفعہ بٹالہ تار لے کر گیا۔ اُس زمانہ میں مولوی محمد حسین بٹالوی لوگوں کو قادیان آنے سے روکا کرتے تھے۔ پیراں دِتّا کو جو انہوں نے دیکھا تو اُسے پکڑ لیا۔ اور کہنے لگے۔ تُو کہاں چلا گیا۔ وہاں کیا رکھا ہے۔ تمہیں وہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ اِس رنگ میں بہت کچھ کہا۔ اُس نے کہا۔ مَیں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں۔ اور نہیں جانتا کہ کیا بات ہے۔ لیکن اِتنا ضرور جانتا ہوں کہ مرزا صاحب اپنے گھر بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر دُور دُور سے لوگ آتے اور یکّوں کے دھکّے کھا کھا کر اُن کے پاس پہنچتے ہیں۔ اور تم یہاں دوڑے پھرتے ہو۔ مگر کوئی تمہیں پوچھتا تک نہیں۔ یہ ایک علمی دلیل ہے ایک مامور من اللہ کی صداقت کی۔ جو ایک جاہل نے پیش کی۔ ایسے جاہل نے جس کی یہ حالت تھی کہ چند آنے لے کر مٹی کا تیل دال میں ڈال کر کھا جاتا تھا۔ اُسے علمی الفاظ نہ آتے تھے۔ لیکن جو کچھ اُس نے کہا وہ علمی دلیل تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی نصرت حضرت مرزا صاحب کے ساتھ ہے اور اُسکی لعنت تم پر پڑ رہی ہے۔

غرض جب کوئی انسان خدا تعالیٰ کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے تو اُس کی عقل تیز ہو جاتی ہے اور وہ روحانیت کے باریک سے باریک معارف بآسانی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ وہ قومیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہم فلاں قسم کی باتیں نہیں سمجھ سکتیں اُن کی عقلی طاقتیں گر جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ موٹی باتیں سمجھنے سے بھی عاری ہو جاتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو رُوحانی اور علمی باتیں سُنائی جاتی ہیں اور وہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن میں سے نہ سمجھنے والوں میں بھی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ میں احمدی زمینداروں کے سامنے بھی علمی تقریر کرتا ہُوا یہ خیال نہیں کرتا کہ اُن کی سمجھ میں نہ آئیگی لیکن کالجوں کے غیر احمدی طالبعلموں کے سامنے بھی علمی تقریر کرتے ہوئے مجھے یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ شائد وہ میری باتیں نہ سمجھ سکیں۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ احمدی علمی اور رُوحانی تقریریں سُننے کے عادی ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگ عادی نہیں ہوتے۔ دین کی باتیں سُننے کا عادی بنانے کے لئے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ بچّہ کے پیدا ہوتے ہی اُس کے کان میں اذان دی جائے۔ اگر

اِس طرح دین کی باتیں سمجھنے کی بچہ میں قابلیت پیدا ہو سکتی ہے تو احمدیوں کے سامنے علمی باتیں بیان کرنے سے وہ کیوں نہیں سمجھ سکتے۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے خود علوم کو مشکل بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے علوم بنائے ہیں۔ اور ہر طبقہ کے لوگوں میں علوم کو سمجھنے کی قابلیت رکھی ہے خواہ وہ زمیندار ہوں خواہ علمی کام کرنے والے۔ اگر لوگ علوم کو خود مشکل نہ بنا دیتے تو کسی انسان کے لئے اُن کا سمجھنا مشکل نہ ہوتا۔ اب ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ دلیل استقرار سے یہ بات ثابت ہے تو بہت لوگ کہہ دیتے ہیں ہمیں کیا معلوم دلیل استقراء کیا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ تمہارے باپ دادا مرتے چلے آئے ہیں یا نہیں تو ہر شخص اس بات کو سمجھ لیگا۔

غرض خدا تعالےٰ نے کسی علم کو مشکل نہیں بنایا۔ علم کو لوگ الفاظ کے ذریعہ مشکل بنا دیتے ہیں۔ اگر لوگ میری تقریر کو بھی نہ سمجھیں گے تو اس میں میری غلطی ہوگی کہ میں نے ایسے الفاظ استعمال نہ کئے جو ان کی سمجھ میں آ سکتے۔ ورنہ قرآن کا کوئی مضمون ایسا نہیں جسے کوئی انسان سمجھ نہ سکے ہاں میں اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں کہ آسان الفاظ میں تقریر کروں۔ باقی روانی میں بعض اوقات مشکل الفاظ بھی نکل جاتے ہیں مگر اس سے مضمون خراب نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کی فضیلت پر نویں دلیل

میں اِس وقت تک قرآن کریم کے افضل ہونے کی آٹھ دلیلیں بیان کر چکا ہوں۔ آج نویں دلیل پیش کرتا ہوں۔

نویں دلیل قرآن کریم کی دوسری الہامی کُتب سے یا دوسرے فلسفوں سے افضل ہونے کی یہ ہے کہ وہ تمام گذشتہ مذاہب کی الہامی کتب میں یا مذہبی فلسفوں میں جو غلطیاں ہیں اُن کو واضح کرتا ہے اور نہ صرف اُن کی غلطیاں واضح کرتا ہے بلکہ اُن کی اصلاح بھی کرتا ہے اور یہ سیدھی بات ہے کہ جو غلطی نکالتا ہے وہ اس سے افضل ہوتا ہے جس کی غلطی نکالی

جاتی ہے۔ اور غلطی نکالنے والا اُستاد اور ماہرِ فن ہوتا ہے۔ اِس دلیل کے مطابق قرآن کریم کی جو افضلیت ثابت ہوگی۔ وہ موجودہ الہامی کتب اور موجودہ مذاہب پر ثابت ہوگی۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن کریم جو غلطی نکالے وہ اصل کتاب میں نہ ہو بلکہ بعد میں داخل ہوگئی ہو۔ یا اس مذہب میں وہ بات نہ ہو اور بعد میں لوگوں نے اس کی طرف منسوب کردی ہو کیونکہ تمام مذاہب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان میں کوئی جھوٹی اور غلط بات خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ پس قرآن کریم جہاں کسی سابقہ کتاب کو نامکمل بتائیگا وہاں یہ معنے ہونگے کہ پہلی کتب میں وہ بات نہ تھی۔ اور جہاں یہ ظاہر کریگا کہ فلاں بات غلط ہے وہاں یہ معنے ہونگے کہ وہ بات خدا نے نہیں بتائی۔ پھر جہاں قرآن فلسفہ کی غلطیاں بتائیگا وہاں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ لوگوں نے اپنی عقل سے وہ باتیں بنالیں جو غلط ہیں۔

مَیں نے کہا ہے کہ پہلی کتابوں میں اصل میں وہ غلطیاں نہ تھیں جو قرآن بتاتا ہے۔ اِس لحاظ سے بھی قرآن کریم اُن سے افضل ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کتابیں اب محرّف و مبدّل ہیں۔ اور چونکہ دنیا کے سامنے وہ موجودہ شکل میں آتی ہیں اور قومیں اُن پر عمل کرتی ہیں۔ وہ اُن سے نقصان اٹھاتی ہیں۔ اِس لئے قرآن کی افضلیت بہرحال ثابت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو سابقہ کتب کی غلطیاں معلوم ہوتی ہیں اور یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اِس وقت سوائے قرآن کریم کے کوئی قابلِ عمل کتاب نہیں ہے۔ قرآن کریم اِس دعویٰ کو خود پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے:۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(النحل آیت ۶۴-۶۵)

قرآن کریم کے چھ دعوے اِن آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھ دعوے پیش کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے بھی رسول آتے رہے ہیں۔

چنانچہ فرمایا۔ تَاللّٰہِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِکَ۔ مجھے اپنی ذات ہی کی قسم کہ پہلی اُمتوں میں بھی رسول بھیجے جاتے رہے ہیں۔ دوسری دعویٰ یہ فرمایا کہ فَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَھُمْ۔ اس کے بعد وہ قومیں بگڑ گئیں۔ اُن کو جو تعلیمیں دی گئی تھیں اُن میں انہوں نقص پیدا کر دیا اور لوگوں نے اپنے نفسانی خیالات کو خوبصورت سمجھنا شروع کر دیا۔

انسان کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ پہلے وہ بدی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اُسکی تائید میں دلائل لاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔ ایک چور سے مَیں نے پُوچھا کہ کبھی تمہیں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ اس کے جواب میں اُس نے کہا۔ اصل میں حلال کی کمائی تو ہماری ہی ہوتی ہے۔ ہم خطرات میں پڑ کر مال حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ اِس طرح ہمیں بہت محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ہمارے لئے حلال ہوتا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ چور بھی اپنی چوری کو جائز قرار دینے کے لئے دلیل پیش کرتے ہیں۔

غرض پہلے انسان بدی کرتا ہے اور پھر اُس کے جواز کی دلیلیں بناتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت میں نیکی رکھی ہے جو بُرے فعل پر اس کو ملامت کرتی ہے۔ چونکہ انسان ہر وقت کی ملامت برداشت نہیں کر سکتا اس لئے اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل پیدا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ شیطان اُن کو اُن کے اعمال خوبصورت دکھانے لگتا ہے۔ اور جب لوگ کسی بُرے فعل کے عادی ہو جاتے ہیں تو اُسے اچھا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

تیسری دعویٰ پر کیا کہ فَھُوَ وَلِیُّھُمُ الْیَوْمَ۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ ساری کی ساری قومیں آج بھی ایسی حالت میں ہیں۔ اب تک اس شیطانی عمل کا اثر اور اس کی لعنت اُن پر باقی ہے۔ کیونکہ جو بگاڑ ایک دفعہ پیدا ہوا۔ اُسے خدا ہی دُور کر سکتا ہے کوئی انسان دُور نہیں کر سکتا۔

چوتھی بات یہ بیان کی کہ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وہ اس نقص کی وجہ سے جہنّم

میں گرنے کے خطرہ میں ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن کی مدد کرنا چاہتی ہے۔

پانچویں بات یہ بیان کی کہ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ رحمت کا دروازہ کھولتا۔ جب اُس کے بندے گمراہ ہو گئے۔ پہلی کتابیں خراب ہو گئیں تو خدا تعالیٰ نے رحمت کا دروازہ کھولا۔ پس اے رسولؐ! اُس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے تاکہ تُو انہیں وہ اصل تعلیم بتائے جس سے اختلاف کر کے وہ اِدھر اُدھر چلے گئے تاکہ بگاڑ دُور ہو۔

چھٹی بات یہ بیان کی کہ پھر اسی پر بس نہیں کیا کہ بگاڑ دُور کر دے بلکہ اس کتاب میں زائد باتیں بھی بیان کی ہیں۔ نہ صرف پہلی کتابوں اور پہلے فلسفوں کی غلطیاں بتائیں۔ بلکہ ایسی باتیں بھی بتائی ہیں جو اس سے پہلے فلسفیوں کے ذہن میں بھی نہیں آئیں۔ اور وہ دو قسم کی ہیں۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ ایک هُدًى اور دوسری رحمت۔ ہدایت کے معنے ہیں ذہنی اور عقلی ترقی کے سامان۔ اور رحمت کے معنے ہیں عملی ترقی اور آرام و آسائش کے سامان۔ گویا قرآن میں صرف ذہن کی ترقی کے سامان ہی نہیں بلکہ عملی ترقی کے سامان بھی ہیں۔ اور یہی دو چیزیں ہوتی ہیں جن کے حاصل کرنے کے لئے تمام مذاہب اور تمام فلسفے کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی۔

الفرقان قرآن کریم ہی ہے

دوسری آیت جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان:۲) فرمایا بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اتارا تاکہ یہ سب زمانوں کے لئے نذیر ہو۔

فرقان کے عربی میں کئی معنے ہیں۔ اُن میں سے دو جو یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں اُن کو میں لیتا ہوں۔ اوّل یہ کہ کل ما فرق به بين الحق والباطل یعنی ہر وہ چیز جس کے ساتھ حق و باطل میں فرق کیا جائے۔ وہ فرقان ہے۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ الصبح والسحر۔ یعنی

پَو پھٹنے کو بھی فرقان کہتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس کتاب کے ذریعہ ایک تو حق و باطل میں تمیز ہو سکتی ہے۔ دوسرے ہم نے اِسے پَو پھٹنے کی طرح بنایا ہے۔ جب پَو پھٹتی ہے تو ہر چیز کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے۔ اِس نے بھی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ (۱) بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر وہ کلام اتارا ہے جو حق و باطل میں فرق کر کے دکھاتا ہے۔ (۲) بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر وہ کلام اتارا ہے کہ جسکی روشنی میں تمام مذاہب کے فلسفے اپنے نقائص آپ دیکھکر ان کی اصلاح شروع کر دیں گے۔ جس طرح پَو پھٹنے پر گھر کا ہر نقص نظر آجاتا ہے۔ اِسی طرح قرآن کی روشنی میں سب مذاہب والوں کو اپنے اپنے ہاں کے نقائص نظر آنے لگ جائیں گے اور وہ اُن کی اصلاح کی کوشش شروع کر دیں گے۔

غرض قرآن میں حق و باطل میں فرق کرنے والے دلائل بھی دیئے گئے ہیں اور تعلیماتِ صحیحہ کو ایسے رنگ میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ خود بخود لوگوں پر اُن کے دین کی کمزوریاں ظاہر ہونے لگ گئی ہیں اور انہوں نے اپنے عیوب چھپانے شروع کر دیئے ہیں۔

اقوامِ عالم کی شرک سے بیزاری

اب دیکھو یہ دونوں باتیں کس طرح پوری ہوئیں؟ اِن میں سے ایک کو تو میں آگے چل کر تفصیل سے بیان کرونگا۔ مگر یہ جو کہا کہ پَو پھٹنے پر لوگ آپ ہی آپ اپنے نقائص دُور کرنے شروع کر دیتے ہیں اِس کی صداقت اِس طرح واضح ہوتی ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ساری قومیں شرک میں مبتلا تھیں۔ یہودیوں نے باوجود اس کے کہ اُن کے ہاں ایک خدا کو ماننے کی تعلیم تھی۔ عزیر کو ابن اللہ قرار دے لیا تھا۔ اِسی طرح زرتشتی مذہب کی بنیاد بھی توحید پر تھی مگر اُس کے ماننے والوں نے بھی خرابی پیدا کر لی تھی۔ اور دو خدا بنا لئے تھے۔ ہندوؤں نے ۳۳ کروڑ معبود بنا لئے تھے۔ چین میں بدھ مذہب تھا۔ اُس نے ہر چیز کا الگ خدا بنا رکھا تھا۔ مثلاً لکڑی کا خدا الگ تھا۔ اور جب اُس لکڑی کی میز

بن جائے تو اس کا الگ۔ ایسے وقت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے اور آپؐ نے یہ تعلیم دی کہ خدا ایک ہے۔ اُس وقت لوگ توحید سے اتنے دُور ہو چکے تھے کہ یہ بات سُن کر انہوں نے قہقہے لگائے۔ آپؐ کے ملک والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص آیت ۶) اس نے تو بہت سے خداؤں کو کوٹ کاٹ کر ایک بنا دیا ہے۔ چونکہ اُن کے واہمہ میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ خدا ایک ہے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خیال کرتے کہ آپؐ نے سب خداؤں کو کوٹ کر ایک بنا دیا ہے۔ گویا وہ ایک خدا کا عقیدہ پیش کرنا حماقت کی بات قرار دیتے تھے۔ اِسی طرح عیسائیوں کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ تین خدا مانتے ہیں۔ غرض سب کی سب قومیں شرک میں مبتلا تھیں لیکن جب قرآن کا نُور پھیلا تو اب یہ حالت ہے کہ آج ایک عیسائی کھڑا ہو کر بغیر یہ محسوس کئے کہ وہ کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے کہتا ہے کہ توحید خالص سوائے انجیل کے اَور کوئی کتاب پیش ہی نہیں کرتی۔ گویا پہلے تو لوگ توحید کا عقیدہ پیش کرنے کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہنستے تھے۔ لیکن اب جبکہ سورج نکل آیا تو انہیں اپنے مُنہ کی سیاہی نظر آگئی اور وہ مُنہ دھونے لگ گئے۔ ہندو ۳۳ کروڑ دیوتا مانتے تھے اور محمود غزنوی سے اِس لئے ناراض تھے کہ اُس نے اُن کے بُت توڑ دیئے۔ لیکن اب ہندو خود بُت توڑتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا سورج نکل آیا۔ اور انہیں پتہ لگ گیا کہ بُت پرستی بہت بُری بات ہے۔ غرض جس قوم کو دیکھو مشرکانہ خیالات کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ کتنا بڑا قرآن کے فرقان ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کے ثبوت میں پینسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر چونکہ یہ ایک ضمنی بات ہے اس لئے مَیں اسے لمبا نہیں کرتا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ یہود۔ نصاریٰ اور مجوس اور ہنود وغیرہ مذاہب میں سے ایک مذہب بھی ایسا نہ تھا جو پہلے شرک میں مبتلا نہ تھا اور نزولِ قرآن کریم کے بعد اُس نے اپنے پہلو کو نہیں بدلا۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ عقلمند کے لئے صرف یہی افضلیت کا ثبوت کافی ہے۔

غرض اِس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ ہر مذہب و ملت اور ہر فلسفہ اور خیال کی غلطیاں نکالی گئی ہیں اور اس کے مقابل پر جو سچی تعلیم تھی وہ بتائی گئی ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایسا ہونا ضروری تھا۔ یہ خیال درست نہیں کہ دوسروں کی غلطیاں نکالنے کی کیا ضرورت تھی اپنی تعلیم پیش کر دینا کافی تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ہم نے قرآن ساری دنیا کے لئے بھیجا ہے۔ نہ صرف یہود کے لئے نہ صرف نصاریٰ کے لئے۔ نہ صرف ہندوؤں کے لئے۔ پھر نہ صرف اہلِ مذاہب کے لئے بلکہ فلسفہ والوں کے لئے بھی۔ اور جب تک حجت تمام نہ ہو نذیر نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری تھا کہ تمام ادیانِ باطلہ اور فلسفۂ باطل اور اوہام باطلہ اور وساوس کا اِس میں ازالہ کیا جاتا۔ ورنہ سب دنیا کی طرف اس کا بھیجا جانا جائز نہ تھا۔

اب دیکھو یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے جو قرآن نے کیا۔ اس کے مقابلہ میں اَور کوئی کتاب ایسا دعویٰ پیش نہیں کر سکتی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی اَور ایسا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا جب تک یہ چھ خوبیاں اُس میں نہ ہوں۔ اوّل جب تک سب کُتب کا اُسے علم نہ ہو۔ جب ویدؔ اور ژند و اوستا وغیرہ کا کسی کو پتہ ہی نہ ہو اُس وقت تک کوئی اُن کی غلطیاں کیونکر نکالیگا۔ اِسی طرح اگر فلسفیوں کے خیالات معلوم نہ ہوں تو اُن کا ردّ کس طرح کرے گا۔ یہ دعویٰ وہی کر سکتا ہے جس کے پاس ساری دنیا کے مذاہب اور سارے فلسفیوں کی کُتب کی لائبریری ہو ایسی لائبریری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو نہ تھی بلکہ عیسیوں مذاہب کا آپؐ کو علم بھی نہ تھا۔ دوسری خوبی اس میں یہ ہونی چاہیئے کہ اُس کی نظر ایسی ہو کہ اُسے غلطیاں نظر بھی آجائیں اور ایسی واقفیت ہو جو ساری کتابوں کے مضامین پر حاوی ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ آپ کے پاس مذاہب عالم کی کتابیں ہی موجود نہ تھیں اُن کے پڑھنے پڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیسری خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ سب فلسفوں کا اُسے علم ہو۔ چوتھی یہ کہ سب قسم کے اوہام اور وساوس کا بھی علم ہو کیونکہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ

قرآن کریم وسوسوں کو بھی دُور کرتا ہے اور یہ کسی انسان کی طاقت میں نہیں ہے کہ انسانوں کے وساوس کا پتہ لگا سکے۔ یہ دعویٰ کوئی انسان کر ہی نہیں سکتا کہ میں انسانوں کے وساوس دُور کر سکتا ہوں۔ جب تک اُسے سب کے افکار کا پتہ نہ ہو۔ اور یہ پتہ لگانا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ پانچویں اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی کو سب قسم کے اوہام اور وساوس وغیرہ کا علم ہو گیا۔ تب بھی وہ اُس وقت تک اُن کا ردّ نہیں کر سکتا جب تک اُس میں جواب دینے کی طاقت نہ ہو۔ اس لئے پانچویں بات اُس میں یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ہر قسم کے اعتراض کو ردّ کر سکے۔ چھٹی خوبی یہ ہو کہ اِس قدر چھوٹی سی کتاب میں جیسی کہ قرآن شریف ہے ساری کتابوں کی غلط باتوں کا ردّ بھی کر دے اور ساری عمدہ باتیں بیان بھی کر دے۔ عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن بائیبل سے چھوٹا ہے۔ حالانکہ بائیبل میں صرف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خدا محبت ہے۔ یہ چھ باتیں سوائے خدا تعالےٰ کے اَور کسی میں نہیں پائی جا سکتیں۔ خدا تعالیٰ کو ہی پتہ ہے کہ دنیا میں کتنے مذاہب ہیں۔ خدا تعالےٰ ہی جانتا ہے کہ کتنے فلسفے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہی کی نظر باریک در باریک باتوں تک پہنچ سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ ہی کی نظر انسانوں کے اوہام اور وساوس کو دیکھ سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ ہی کی قدرت میں یہ بات ہے کہ سب غلط باتوں کا ردّ کرے اور خدا تعالیٰ ہی چھوٹی سی کتاب میں سب کچھ بیان کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پس یہ دعویٰ سوائے الٰہی کتاب کے اَور کوئی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ۔ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق، ۱۷) پہلی آیت میں تو صرف مذہبی کتب کے ماننے والوں کی غلطیاں نکالنے کا دعویٰ تھا۔ لیکن اس آیت میں سب انسانوں کی خواہ اُن کا مذہبی کتب سے تعلق ہو یا محض عقلی دلائل پر اُن کے خیالات کی بنیاد ہو غلطیاں بیان کرنے کا ذکر ہے۔ دوسری کُتب تو ان اعتراضات تک کو بیان بھی نہیں کرتیں جو مذہب کے خلاف عائد ہوتے ہیں۔ کُجا یہ کہ اُن کے جواب دینے کا دعویٰ کریں۔

دنیا کو چیلنج یہ اتنا بڑا دعویٰ ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ صرف یہی دعویٰ قرآن کریم کی افضلیت ثابت کر سکتا ہے۔ اور اس دعویٰ کا پرکھنا بالکل آسان کام ہے۔ لوگ چند عجیب و غریب اعتراضات مذہب کے بارہ میں پیش کر دیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کریم میں اُن کا جواب موجود ہے یا نہیں۔ خود مَیں نے ساری دنیا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ وہ مذہب پر کوئی اعتراض کریں۔ مَیں اُن کے تمام اعتراضات کا قرآن کریم سے ہی جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔ وہ کتاب کی شکل میں اپنے اعتراضات شائع کر دیں۔ پھر میرا فرض ہوگا کہ اُن کا جواب مَیں قرآن سے ہی دوں۔ اگر مَیں ایسا نہ کر سکوں تو بے شک لوگ مجھے کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے کہ قرآن نے ہر ایک اعتراض کا جواب دے دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی اس آزمائش کے لئے تیار ہو تو خدا تعالیٰ مجھے کامیاب کریگا۔ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ سورہ فاتحہ جو قرآن کی جڑ ہے مجھے سکھائی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ جب قرآن کریم نازل کرنے والے خدا کے فرشتوں نے مجھے سورۃ فاتحہ سکھائی اور اس کے معارف بتائے۔ اور فرشتہ نے مجھے یہ بھی کہا کہ مَیں تجھے وہ باتیں سکھاتا ہوں جو کسی کو معلوم نہیں تو کسی مخالف کا کوئی ایسا اعتراض نہیں ہو سکتا جس کا مَیں قرآن کریم سے ہی جواب نہ دے سکوں اس لئے مَیں سب مخالفینِ اسلام کو پھر چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کوئی مخالفانہ بات پیش کریں۔ اصولی طور پر اس کا ردّ مَیں قرآن کریم سے ہی دکھا دوں گا۔ میرے پاس پچھلے دنوں ایک صاحب آئے اور آکر کہنے لگے۔ مَیں کچھ مذہبی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے کہا۔ بڑی خوشی سے پوچھیے۔ کہنے لگے۔ مرزا صاحب کے دعویٰ کے متعلق پوچھتا ہوں کہ کیا قرآن اسکی تصدیق کرتا ہے۔ مَیں نے کہا۔ ہاں کرتا ہے۔ کہنے لگے۔ کوئی آیت بتائیے۔ مَیں نے کہا۔ کوئی آیت کیا۔ سارا قرآن ہی تصدیق کرتا ہے۔ کہنے لگے یہ کس طرح؟ مَیں نے کہا۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے۔ آپ کوئی آیت پڑھیں مَیں اُس سے ثابت کر دوں گا۔ اور خدا تعالیٰ کے تصرف کے ماتحت اُسی سے سمجھا دونگا۔ مَیں نے کہا۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ہی پڑھ دیجیے۔ یہ سُن کر

وہ کچھ گھبرا سے گئے کہ اس سے شائد اپنا دعویٰ ثابت کردیں اس لئے اُسے چھوڑ کر انہوں نے یہ آیت پڑھی کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ[1] مَیں نے کہا۔ ایمان لانے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان لائے مگر وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ اور ایک وہ جو واقعہ میں ایمان لاتے ہیں۔ اب ایسے لوگ جو سمجھتے تو ہیں کہ ایمان لائے مگر درحقیقت ایمان نہیں لائے۔ جب مرکر خدا تعالیٰ کے سامنے جائینگے تو خدا تعالیٰ اُن سے پوچھیگا کہ تم نے تو ایمان کا دعویٰ کیا تھا مگر حقیقت میں تم ایمان نہیں لائے تھے۔ وہ کہیں گے پھر ہمیں کسی رسول کے ذریعے بتایا کیوں نہیں گیا۔ مَیں نے اُن صاحب سے پوچھا۔ آجکل کتنے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ بہت کم۔ مَیں نے کہا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور وہ سمجھتے بھی ہیں کہ ایمان لائے مگر حقیقت میں ایمان نہیں لائے ہوتے۔ ان کے لئے کیا ہوگا۔ قرآن کریم سچا ہو ہی نہیں سکتا جب تک ایسے لوگوں کا علاج نہ کرے۔ پس اگر ایسے لوگ ہو سکتے ہیں اور ہیں تو اُن کو راہِ راست دکھانے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور بھی آنا چاہیئے۔

قرآن کریم کی پہلی اصولی اصلاح ہستیٔ باری تعالیٰ کے متعلق

اب مَیں مثال کے طور پر بعض اُن باتوں کو لیتا ہوں جو اصولی ہیں اور بتاتا ہوں کہ قرآن کریم نے کس طرح دوسرے مذاہب یا فلسفیوں کے خیالات کی غلطیاں نکالیں اور اُن کی اصلاح کی ہے۔ پہلی بات جو مذہب کا سوال سامنے آتے ہی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس دُنیا کا کوئی خدا ہے یا یہ دنیا آپ ہی آپ ہے اور اس کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔

اِس بات کو قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خدا کوئی نہیں۔ اور ان کے منبع علم کی بھی تشریح کی ہے۔ مگر مَیں ان مثالوں کے متعلق صرف ایک ایک دلیل دونگا تفصیل میں نہیں جاؤنگا۔

[1] البقرہ: ۹

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ [1] یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایک مقررہ قاعدہ کے ماتحت مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں۔ ورنہ کوئی ایسی ہستی نہیں جو یہ کام کر رہی ہے۔

جو لوگ دہریہ ہوتے ہیں اُن میں سے کئی ایسے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے رد میں دلیلیں دینے لگ جاتے ہیں لیکن جو بڑے بڑے اور ہوشیار دہریہ ہوتے ہیں جیسے ہکسلے وغیرہ وہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دلیل خدا کے ہونے کی نہیں ملتی۔ چنانچہ جب ہکسلے سے پوچھا گیا کہ تیرا مذہب کیا ہے؟ تو اُس نے کہا "یہ کہ میں نہیں جانتا"۔ غرض ان کی بنیاد نفی پر ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ بات بتا دی ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ۔ خدا کے منکر صرف یہی بات کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ خدا نہیں ہے۔ اس کے لئے کوئی مثبت دلیل اُن کے پاس نہیں ہوتی۔ صرف وہم اور گمان ہوتا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ اور نفی پر قطعیت کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ تو دہریت کا ذکر ہے۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ دہریت کو قرآن نے کس طرح رد کیا ہے۔ مگر صرف ایک دلیل دونگا۔ اور وہ یہ ہے کہ سورۃ جاثیہ کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ [2] کہ اس دُنیا میں ایک ایسا بادشاہ نظر آ رہا ہے جو آسمان اور زمین دونوں پر قابض ہے۔ اور جس کی طاقتوں کا مظاہرہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اس جگہ آسمان سے شرعی نظام اور زمین سے طبعی نظام مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی یعنی شرعی اور زمینی یعنی طبعی نظاموں میں ایک زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔ جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب کچھ اتفاق سے اور آپ ہی آپ ہے۔ اگر طبعی نظام آپ ہی آپ ہے تو نبیوں کے کلام سے اُس کا تطابق کیوں ہوتا؟ ان دونوں میں تو ایسا اتحاد ہے کہ اُسے دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس دنیا کو چلانے والا کوئی نہیں۔ یہ مشاہدہ اور نظامِ عالم کی دلیلیں میرے لیکچر "ہستی باری تعالیٰ"

[1] الجاثیہ: ۲۵ [2] الجاثیہ: ۲۹

میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ یعنی خدا کے کلام اور طبعی نظام کا آپس میں اتحاد۔ جسے دیکھکر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہے۔ اگر طبعی نظام آپ ہی آپ ہے تو نبیوں کے کلام سے اس کا تطابق کیوں ہوتا ہے! پس شرعی اور طبعی نظام کا ایک دوسرے کی تائید کرنا بلکہ طبعی نظام کا شرعی نظام کے تابع چلنا بتاتا ہے کہ اس دنیا کا چلانے والا کوئی ضرور موجود ہے۔ یہ دلیل مجموعہ ہے دلیل مشاہدہ اور دلیل نظام کا۔ اور میرے نزدیک سب دلیلوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ دلیل نظام یہ بتاتی ہے کہ سب دنیا ایک نظام کے نیچے ہے۔ اور دلیل مشاہدہ یہ بتاتی ہے کہ شریعت اپنے ساتھ ثبوت رکھتی ہے۔ اور ان دونوں دلیلوں کا مجموعہ یہ بتاتا ہے کہ دونوں نظام ایک دوسرے سے متحد ہیں اور یہ اتحاد سب سے بڑا ثبوت ہے ہستیٔ باری تعالیٰ کا۔ اس کے متعلق میں ایک مثال قرآن کریم سے ہی پیش کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ آسمان کا نظام کس طرح زمینی نظام سے متفق ہوا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو سال ہوئے دعویٰ کیا کہ میں خدا کی طرف سے ہوں۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ زمین و آسمان پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ خدا تعالیٰ کے نشانات میری تائید میں ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کے ساتھ ہی وہ دنیا جو ایک نظام کے ماتحت چل رہی تھی اس میں ایسے تغیرات رونما ہونے لگ جاتے ہیں جو آسمانی کلام کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اسی ہستی کے احکام کے ماتحت چل رہی ہے جس کی طرف سے قرآن آیا۔

بعثتِ محمدیؐ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

اس کے ثبوت کیلئے کہ کس طرح آسمان اور زمین کی بادشاہت ایک ہستی کے ماتحت چل رہی ہے میں آج سے چار ہزار سال پیچھے جاتا ہوں۔ آج سے چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادیں بلند کرتے ہوئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر یہ دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (بقرہ: ۱۳۰) یعنی اے خدا ہم تجھ سے یہ دُعا کرتے ہیں کہ اس ملک میں جو ہماری آئندہ نسل پھیلے گی۔ اُس میں سے تو ایک رسول بھیج جس کے یہ کام ہوں کہ یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ۔ وہ تیری آیات انہیں پڑھ کر سنائے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ۔ شریعت کی باتیں انہیں سکھائے وَالْحِكْمَةَ اور احکام کی حکمتیں اُن پر واضح کرے۔ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ اور انہیں پاک کرے اور بدیوں سے بچائے۔ یہ دُعا چار ہزار سال پہلے ایسی جگہ پر کی گئی جہاں نہ غلہ پیدا ہوتا تھا اور نہ اور کسی قسم کی کھیتی۔ زمزم کا چشمہ جو نشان کے طور پر قائم ہوا اس کا پانی بھی کھاری ہے۔ جسے ہندوستانی نہیں پی سکتے۔ اس کھاری پانی کے چشمہ کے پاس چند گھر آباد تھے۔ وہاں پتھروں کا ایک مکان بناتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب جو لوگ یہاں پیدا ہوں اُن میں تو اپنا ایک رسول بھیج جو تیری ہستی کے دلائل انہیں بتائے۔ لوگوں کو تیری شریعت سکھائے۔ اس شریعت کی حکمت یعنی باریکیاں بتائے کہ شریعت پر عمل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ پھر اُن کو پاک بنائے۔

اِس دُعا پر اگر غور سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں مندرجہ ذیل امور کی خبر دی گئی ہے۔

اوّل اس عرصہ تک کہ اس نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آئے مکّہ قائم رہے گا۔ اب طبعی صورت تو یہ ہے کہ آندھیاں آتی ہیں جو شہروں کے شہر برباد کر دیتی ہیں۔ زلزلے آتے ہیں جو بڑے بڑے شہروں کو تودہ خاک بنا دیتے ہیں۔ مگر یہاں پہلے سے خبر دے دی گئی کہ تمام قسم کے حادثات اس آبادی کو اجاڑ نہ سکیں گے۔ اور آخر ایسا ہی ہوا۔

دوسری بات یہ بتائی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل ہمیشہ قائم رہے گی۔ کیونکہ کہا یہ گیا کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اس رسول کے آنے تک حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل موجود ہوگی۔

دنیا کے اکثر گھرانے ایسے ہوتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ تین چار سو سال تک اُن کی نسل چلتی ہے اور پھر مٹ جاتی ہے مگر حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے متعلق یہ کہا گیا کہ وہ ہزار سال تک یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے تک اُن کی نسل بہرحال قائم رہے گی۔ بیماریوں پر یہ پیشگوئی حکومت کریگی تاکہ وہ اس نسل کو تباہ نہ کر سکیں۔ لڑائیوں اور جنگوں پر یہ پیشگوئی حکومت کریگی تاکہ وہ اس نسل کا خاتمہ نہ کریں۔ اسی طرح ہر قسم کے حادثات پر یہ پیشگوئی حکومت کریگی تاکہ وہ اس نسل کو مٹا نہ دیں۔ اولاد کی اولاد ہوتی چلی جائیگی اور یہ نسل ہمیشہ قائم رہیگی۔

تیسری بات اِس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ ابراہیمؑ کی نسل میں سے ایک رسول آئیگا حالانکہ کوئی شخص دعویٰ کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی نسل میں کس قسم کے انسان پیدا ہونگے۔

چوتھی بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اس قوم کی کایا پلٹ دیگا۔ اور وہ لوگ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کو پاک کر سکتے ہیں۔ ایک شاگرد کو ایک استاد پاک نہیں کر سکتا۔ بوعلی سینا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کو ایک کتاب پڑھا رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے ایک شاگرد نے کہا کہ آپ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی بڑھ کر ہیں۔ بوعلی سینا مومن آدمی تھے مگر علم النفس کے ماہر تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ ممکن ہے اِس وقت اگر میں اسے سمجھاؤں تو اس کی سمجھ میں بات نہ آئے۔ اور یہ ضد میں آکر گمراہ ہو جائے۔ اِس لئے چُپ رہے لیکن ایک دن جبکہ سردی کا موسم تھا اور تالاب کا پانی سخت سردی سے جما ہوا تھا انہوں نے اُس شاگرد سے کہا کہ کپڑے اتارو اور تالاب میں کود پڑو۔ اُس نے کہا۔ آپ یہ کیسی احمقانہ بات کر رہے ہیں۔ کیا میں پانی میں کود کر مر جاؤں۔ انہوں نے کہا۔ اُس دن تو تم مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑا کہہ رہے تھے اور آج اتنی بات بھی نہیں مانتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ تھے کہ آپ کے ماننے والوں نے کبھی نہ کہا کہ ہم مر جائیں گے۔ بلکہ آپؐ جو کچھ کہتے فوراً اُس پر عمل کرتے خواہ موت سامنے نظر آتی۔ اور خوشی خوشی آپؐ کے لئے جانیں دے دیتے۔

غرض یہ کتنی بڑی بات بتائی کہ وہ ایک دو کی نہیں بلکہ قوم کی قوم کی کایا پلٹ دیگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اِس پیشگوئی کے دو ہزار سال بعد مکّہ موجود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل موجود تھی۔ ہوسکتا تھا کہ نسل موجود ہوتی مگر انہیں پتہ نہ ہوتا کہ کس کی اولاد ہیں۔ مگر خدا تعالےٰ نے ایسا انتظام کر دیا کہ بائیبل میں بھی ذکر کر دیا کہ یہ ابراہیم کی نسل ہے۔ اس طرح اُن میں یہ احساس بھی قائم رکھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ پھر ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے آپؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس قوم کی کایا پلٹ دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی

پھر ہم کچھ اَور نیچے آجاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو پھر دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر چھ سو سال گذرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوتے ہیں۔ اور وہ آپؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کی یہ بات بتاتے ہیں کہ

"مَیں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا۔ اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔" (استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸)

اِس سے ابراہیمی دُعا کی تصدیق کی گئی۔ حضرت اسحاقؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بھائی تھے اور حضرت موسیٰؑ حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے۔ گویا ان کے بھائیوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کیا گیا اور اس طرح چھ سو سال کے بعد پھر ابراہیمی وعدہ کا تکرار کیا گیا۔ گویا اس میں پھر حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل کے قائم رہنے اور اُن میں سے ایک نبی کے مبعوث ہونے کی خبر دی جاتی ہے۔

پھر اُس شخص کے متعلق ایک اَور امر بیان کیا جاتا ہے کہ

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اُس کے داہنے ہاتھ

ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی۔" (استثنا باب ۳۳ آیت ۲)

سینا وہی پہاڑ ہے جسے قرآن شریف میں طور کہا گیا ہے۔ اِس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور مراد ہے۔ شعیر سے بعض نے حضرت مسیح مراد لئے ہیں۔ مگر یہ اُن پہاڑوں کا نام بھی ہے جن میں سے گذر کر حضرت موسیٰؑ آئے۔ اور انہوں نے دشمن پر فتح پائی تھی۔ اس لئے یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔

آگے فرماتا ہے۔ "فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔" اِس میں بھی دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوگا۔ دوم یہ کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئیگا۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی وجود کے متعلق ہیں۔ جس طرح پہلی دو بھی ایک ہی کے متعلق ہیں۔

پھر بتایا کہ آتشی شریعت اس کے ساتھ ہوگی۔ اِس میں یہ خبر ہے کہ وہ فاران کی پہاڑیوں سے جو مکّہ کے گرد کے پہاڑ ہیں دس ہزار قدوسیوں سمیت آئیگا اور آتشی شریعت اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اِس پیشگوئی میں یہ بتایا گیا ہے کہ (۱) وہ نبی مکّہ سے نکالا جائیگا کیونکہ پہلے بتایا کہ وہ مکّہ میں پیدا ہوگا۔ پھر کہا کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ مکّہ سے نکالا جائیگا (۲) یہ کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک لشکر کے ساتھ مکّہ پر حملہ آور ہوگا۔ (۳) یہ کہ اس کے ساتھ دس ہزار سپاہی ہونگے۔ (۴) یہ کہ وہ لوگ قدوسی ہونگے یعنی یُزَکِّیْھِمْ کے مصداق ہونگے۔ (۵) یہ کہ اُس کے ساتھ گناہ سوز شریعت ہوگی۔ یہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ کا ترجمہ ہے۔ جب انسان کو معلوم ہو کہ فلاں حکم کے ماننے میں میرا فائدہ ہے تو اس پر عمل کرتا ہے۔ شریعت کا لفظ الکتٰب سے اور گناہ سوز کا مفہوم حکمۃ سے نکلتا ہے۔ کیونکہ حکمت معلوم کرنے کے بعد انسان گناہ کے نزدیک جانے سے احتراز کرتا ہے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ اِس پیشگوئی میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ پورا ہوا۔ فاران کی

پہاڑیاں تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مکّہ کی پہاڑیاں ہیں۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ " وادیٔ فاطمہ میں (یہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان ایک پڑاؤ ہے) گُل جذبیہ یعنی پنجۂ مریم بیچنے والوں سے پوچھو کہ وہ پھول کہاں سے لاتے ہیں تو لڑکے اور بچے بھی یہی کہیں گے کہ مِنْ بَرِّیَّۃِ فَارَانَ یعنی دشتِ فاران سے (فصل الخطاب جلد دوم ص۳۵)۔ بائبل میں بھی ایسے حوالے موجود ہیں۔ جن سے اشارۃً ثابت ہوتا ہے کہ وادیٔ فاران یہی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیشگوئی

اس کے بعد اور چار سو سال گذرتے ہیں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام آتے ہیں تو وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں گیت گاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اے یروشلم کی بیٹیو! (یعنی بنی اسرائیل) میں تمہیں قسم دیتی ہوں کہ اگر تمہیں میرا محبوب (مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) مل جائے تو تم اُسے کہیو کہ میں عشق کی بیمار ہوں۔"

وہ جواب دیتی ہیں:۔

"تیرے محبوب کو دوسرے محبوبوں کی نسبت سے کیا فضیلت ہے۔ اے تُو جو عورتوں میں جمیلہ ہے تیرے محبوب کو دوسرے محبوب سے کیا فضیلت ہے جو تو ہمیں ایسی قسم دیتی ہے۔"

اس پر وہ فرماتے ہیں:۔

"میرا محبوب سُرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔ اُس کا سر ایسا ہے جیسے چوکھا سونا۔ اُس کی زلفیں پیچ در پیچ ہیں اور کوے کی سی کالی ہیں۔ اس کی آنکھیں اُن کبوتروں کی مانند ہیں جو لب دریا دودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھے ہیں۔ اُس کے رُخسار پھولوں کے چمن اور بلسان کی اُبھری ہوئی کیاریوں کی مانند ہیں۔ اُس کے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہُوا مُر ٹپکتا ہے۔ اُس کے ہاتھ ایسے ہیں جیسے سونے کی کڑیاں جن میں ترسیس کے

جواہر جڑے ہیں۔ اس کا پیٹ ہاتھی دانت کا سا کام ہے جس پر نیلم کے گل بنے ہوں۔
اُس کے پَیر ایسے جیسے سنگِ مرمر کے ستون جو سونے کے پایوں پر کھڑے کئے
جائیں۔ اُس کی قامت لبنان کی سی۔ وہ خوبی میں رشکِ سرو ہے۔ اس کا مُونہہ
شیرینی ہے۔ ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے (عبرانی میں لکھا ہے وہ محمدیم ہے) اے یروشلم
کی بیٹیو! یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے۔" (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۸ تا ۱۶)

گویا حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اس امر کی تاکید کرتے ہیں۔ کہ جب وہ محبوب آئے تو
اُسے مان لینا۔ اور پھر خود ہی سوال پیدا کرکے کہتے ہیں کہ اس میں یہ یہ خوبیاں ہونگی۔ ان آیات
میں بعض باتیں تو شاعرانہ رنگ رکھتی ہیں اور بعض رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حلیہ سے
قطعی طور پر ملتی ہیں۔ مثلاً لکھا ہے۔ اُس کی زلفیں پیچ در پیچ ہیں۔ انگریزی بائیبل میں یہ الفاظ
آتے ہیں۔ "His locks are wavy" ۔ اور یہی حلیہ حدیثوں میں بیان
ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بالطویل الممغط ولا بالقصیر المتردد۔ کان ربعۃً من القوم لم یکن بالجعد القطط و
لا بالسبط کان جعدًا رجلا۔ (شمائل ترمذی و مشکوٰۃ باب اسماء النبیؐ وصفاتہ) یعنی رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نہ تو بہت لمبے قد کے تھے۔ نہ بہت چھوٹے بلکہ آپ میانہ قد وقامت رکھنے والوں
میں سے تھے۔ اسی طرح آپؐ کے سر کے بال نہ تو سخت گھنگھرالے تھے جیسے کہ حبشیوں کے ہوتے
ہیں اور نہ ہی بالکل سیدھے تھے بلکہ اس طرح کے گھنگھرالے تھے جس طرح کنگھی کرنے سے بال
نیچے سے ذرا خمیدہ ہو جائیں۔ اور مڑ جائیں۔ یہی حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ آپ کے بال لمبے ہونگے
یعنی زلفیں ہونگی مگر بال کچھ پیچ دار ہونگے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال کانوں
کی لو تک آتے تھے۔ گویا لمبے بال ہونے کے ساتھ یہ بھی پیشگوئی تھی کہ بال نہ پیچدار ہونگے
اور نہ بالکل سیدھے اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔
پھر حضرت سلیمانؑ آپ کا رنگ سُرخ و سفید بیان کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رنگ کے متعلق فرماتے ہیں ابیضؔ مشوب اور مشرب کے معنے لغت والے یہ لکھتے ہیں کہ ایسا سفید رنگ جس میں سُرخی ملی ہوئی ہو۔

پھر حضرت سلیمانؑ نے یہ فرمایا کہ وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوگا۔ یعنی چھوٹے قد کا نہ ہوگا۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بھی آتا ہے کہ آپ کا قد ایسا تھا جو لمبائی کی طرف مائل تھا۔ گویا حضرت سلیمانؑ کی بیان کی ہوئی سب باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زلفیں تو اس قدر مشہور ہیں کہ لوگ ان کے متعلق شعر کہا کرتے ہیں۔

یسعیاہ نبی کی پیشگوئی

اب ہم کچھ اور نیچے چلتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سات سو سال بعد اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تیرہ سو سال بعد یسعیاہ نبی کے زمانہ میں آتے ہیں۔ یہ پھر حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کی بات کو دہراتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہوا۔ اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا۔ اور سلطنت اس کے کاندھے پر ہوگی۔ اور وہ اس نام سے کہلاتا ہے۔ عجیب۔ مشیر۔ خدائے قادر ابدیت کا باپ (انگریزی میں ہے Everlasting Father یعنی ہمیشہ رہنے والا باپ) سلامتی کا شہزادہ۔ اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ وہ داؤدؑ کے تخت پر اور اس کی مملکت پر آج سے لیکر ابد تک بندوبست کرے گا اور عدالت اور صداقت سے اسے قیام بخشیگا۔ رب الافواج کی غیوری یہ کریگی"۔

(یسعیاہ باب ۹ آیت ۶-۷)

اس میں بتایا کہ جب وہ رسول آئیگا تو لوگ کہیں گے۔ عجیب ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لوگ کہا کرتے تھے۔ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (جنّ: ۲) ہم نے یہ کتاب سُنی ہے جو عجیب اور نرالی قسم کی ہے۔ متی باب ۲۱ آیت ۴۲ میں بھی حضرت مسیحؑ نے

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام عجیب رکھا ہے۔ چنانچہ آتا ہے:۔

"یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب" (متی باب ۲۱ آیت ۴۲)

دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ اُس کا نام مشیر ہوگا۔ یعنی وہ مشورے دینے والا ہوگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں۔ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہو کہ لوگ اُس سے مشورے لیتے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (مجادلہ: ۱۳) اے مومنو! تمہاری عادت ہے کہ تم رسول سے مشورے لیا کرتے ہو۔ مگر رسول کا وقت بڑا قیمتی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ جب مشورہ لو تو مسکینوں کے لئے صدقہ کیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہوگا۔ اور اگر تم میں سے کوئی صدقہ نہ کر سکے تو اللہ اس کمزوری کو دُور کرنے والا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے بعض اوقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جا رہے ہوتے تو کوئی بڑھیا آپ کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی کہ مجھے آپ سے مشورہ لینا ہے۔ مسجد میں بھی لوگ آپ سے مشورہ کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص اتنی دیر آپ سے باتیں کرتا رہا کہ مسجد میں جو لوگ نماز پڑھنے آئے تھے وہ سو گئے۔

تیسرا نام خدائے قادر بتایا گیا ہے۔ توریت میں خدا کا لفظ مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ "پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ دیکھ میں نے تجھے فرعون کیلئے خدا سا بنایا (خروج باب ۷ آیت ۱)۔ متی باب ۲۱ آیت ۴۰ میں حضرت مسیحؑ مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "جب انگورستان کا مالک آئیگا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کریگا۔" گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کو حضرت مسیح نے خدا کا آنا بتایا۔

اب ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ میں نے تجھے فرعون کے لئے خدا سا بنایا اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا [1]

[1] المزمل: ۱۶

یعنی جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو فرعون کے لئے خدا سا بنا کر بھیجا تھا اسی حیثیت سے ہم نے تجھے دنیا کے لئے بھیجا ہے۔

چوتھا نام آپؐ کا ابدیت کا باپ بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ۔ (احزاب: ۷) یعنی نبی کا تعلق مومنوں کے ساتھ باپوں سے بھی زیادہ ہے اور اُس کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں مائیں ہوئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم باپ ہوئے سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع میں آتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ[1]۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں تو کسی کے باپ نہیں لیکن روحانی باپ ہیں رسول ہونے کی وجہ سے۔ اور ابدی باپ ہیں خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے۔

پانچواں نام سلامتی کا شہزادہ بتایا گیا ہے۔ عبرانی میں بادشاہ کی جگہ شہزادہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا اپنے الفاظ میں یہ مطلب ہوا کہ سلامتی کا بادشاہ۔ اور سلامتی اسلام ہے۔ اس لئے اصل نام یہ ہوا کہ اسلام کا بادشاہ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ (الحج: ۷۹) یوں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بادشاہ تھے۔ فتح مکہ پر مکہ والوں کو آپؐ نے بُلا کر کہا۔ بتاؤ اب تم سے کیا سلوک کیا جائے۔ تو انہوں نے کہا۔ آپ وہی سلوک کریں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ[2] جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اس طرح بھی آپؐ نے سلامتی ہی دکھائی۔

پھر چھٹی بات آپؐ کے متعلق یہ بیان کی گئی ہے کہ داؤدؑ کے تخت پر اور اس کی مملکت پر آج سے ابد تک بندوبست کریگا۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے متعلق پیشگوئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ شام اور فلسطین پر قبضہ انہیں حاصل ہوگا۔

پھر اُسی کتاب میں ہم عرب کی بابت الہامی کلام پڑھتے ہیں کہ

"عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے۔ اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کے

[1] الاحزاب: ۴۱ [2] یوسف: ۹۳

پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے ننگی تلوار اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدّت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور تیراندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔" (یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷)

اِس جگہ یہ پیشگوئی بیان کی کہ جو آنے والا نبی ہوگا جب وہ اپنے وطن سے نکالا جائیگا تو ہجرت کے ایک سال بعد اُس کی قوم اس پر حملہ کرے گی۔ ایک رات میدان میں سوئیں گے اور صبح کو جنگ ہوگی جس میں دشمن شکست کھائیگا اور اُس کے بڑے بڑے بہادر مارے جائینگے یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بدر کی جنگ سے پوری ہوئی۔

اب دیکھو اس میں کتنی باتیں بیان کی گئیں۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ (۱) پہلے اس رسول کو مکہ والے اپنے شہر سے نکالیں گے اور (۲) پھر لڑائی کے لئے مکّہ والے آئیں گے۔ اگر وہی جس نے یسعیاہ پر یہ کلام نازل کیا تھا دنیا پر قابض نہ تھا اور دنیا اُس کے ہاتھ میں نہ تھی۔ تو اُس نے کیوں اہل مکّہ سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ سے نکلوایا۔ اور ایک سال کے بعد کس نے ان کو حملہ کرنے کے لئے نکالا۔ (۳) پھر جب انہوں نے حملہ کیا۔ تو اس حملہ میں سارے سردار شامل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ مکّہ کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی اس جنگ میں شریک نہ ہوا ہو (۴) پھر اس جنگ میں بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ اِن باتوں سے ظاہر ہے کہ خیالات پر اور تلواروں پر اُسی کا قبضہ تھا جس نے یسعیاہ کے ذریعہ یہ پیشگوئی کرائی تھی۔ مکّہ میں اس جنگ کی وجہ سے ایسی تباہی آئی کہ ہر گھر میں ماتم برپا ہوگیا اور اس ڈر سے کہ لوگ دل نہ چھوڑ بیٹھیں اُن کو حکماً رونے سے منع کر دیا گیا۔ ایک شخص کے تین بیٹے تھے اور وہ تینوں اس جنگ میں مارے گئے۔ وہ اندر چھپ چھپ کر روتا تھا مگر

اُس کی تسلّی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن ایک شخص کا اونٹ گُم ہو گیا۔ اور وہ رونے لگ گیا۔ اُس شخص نے اُس کے رونے کی آواز سُنکر کسی سے کہا۔ دیکھ کیا بین ڈالنے کی اجازت مِل گئی ہے اور پھر فوراً باہر نکل کر پیٹنے لگ گیا۔ اور زور زور سے بین ڈالنے لگا۔

غرض ہجرت کے عین ایک سال بعد بدر کی جنگ ہوئی اور اُس میں قیدار کے بڑے بڑے جنگ جُو اور بہادر مارے گئے اور شکست کھا کر بھاگے۔ اور تیما جسے عرب تہامہ کہتے ہیں اس میں ماتم برپا ہو گیا۔

پھر یسعیاہ نبی ہی کہتے ہیں :-

" دیکھ مَیں نے اسے قوموں کے لئے گواہ مقرر کیا۔ بلکہ لوگوں کا ایک پیشوا۔ اور فرمانروا۔ دیکھ تو ایک گروہ جسے تو نہیں جانتا بلا دیگا۔ اور وے گروہیں تجھے نہیں جانتیں۔ خداوند تیرے خدا اور اسرائیل کے قدوس کے لئے جس نے تجھے جلال بخشا تیرے پاس دوڑتی آئینگی۔" (یسعیاہ باب ۵۵ آیت ۴-۵)

اِس میں یہ باتیں بتائیں کہ (۱) وہ لوگوں کے لئے گواہ ہوگا۔ (۲) لوگوں کے لئے پیشوا اور (۳) فرمانروا ہوگا (۴) ایسی قومیں اُس پر ایمان لائیں گی جنہوں نے بنی اسرائیل کے نام نہ سُنے ہوں گے۔ اور نہ بنی اسرائیل نے اُن کے۔

لوگوں کے لئے گواہ ہونے کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (الحج ۷۹) یعنی ہم نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اس زمانہ میں بھی اور پہلے بھی تاکہ یہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم باقی دنیا پر گواہ ہو اور اس رسالت کو قیامت تک لئے چلے جاؤ۔ گویا وہی الفاظ جو بائبل میں آتے ہیں قرآن کریم میں بھی آئے ہیں۔

(۲-۳) پیشوا اور فرمانروا کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آلِ عمران ۳۲) یعنی اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت

کرنا چاہتے ہو تو میری فرمانبرداری اختیار کرو۔ میں تمہارا پیشوا اور فرمانروا ہوں۔

چوتھی بات یہ بیان فرمائی کہ دوسری قومیں اس رسول پر ایمان لاویں گی۔ سو اس کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ (اعراف: ۱۵۹) یعنی تُو ساری دنیا سے کہدے کہ میں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ اب دیکھ لو ہم میں سے کوئی کسی قوم کا ہے اور کوئی کسی قوم کا۔ اور یہ قومیں نہ عربوں کو جانتی تھیں اور نہ عرب انہیں جانتے تھے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں سب ایک ہو گئی ہیں۔

پھر یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۲ تا ۵ میں ہی لکھا ہے:۔

"تب قومیں تیری راستبازی اور سارے بادشاہ تیری شوکت دیکھیں گے اور تو ایک نئے نام سے کہلایا جائیگا جو خداوند کا مونہہ خود تجھے رکھ دے گا اور تو حفیظباہ کہلائیگی اور تیری سرزمین بعولاہ۔ کیونکہ خداوند تجھ سے خوش ہے اور تیری زمین خاوند والی ہوگی۔"

اس میں بتایا گیا ہے کہ آنے والے موعود کے زمانہ میں اُس کی قوم حفیظاہ کہلائیگی۔ اور اُس کی زمین بعولاہ۔ سارے بادشاہ اس کی شوکت دیکھیں گے۔ اور اُس کا نیا نام رکھا جائیگا پھر لکھا ہے:۔

"تب وہ مقدس قوم اور خداوند کے چھڑائے ہوئے کہلائیں گے اور تُو مطلوبہ کہلائیگی۔ اور وہ شہر جو ترک کیا نہ گیا۔" (یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۱۲)

یہ سب باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً (۱) کہا گیا ہے کہ وہ ایک نئے نام سے کہلائیگا۔ جسے خداوند کا مونہہ خود رکھ دیگا۔ چنانچہ یہ نیا نام اسلام ہے جو خدا تعالیٰ نے خود رکھا اور ارشاد فرمایا کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ[1] خدا نے خود تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب ایسا نہیں جس کا نام خدا نے رکھا ہو۔ نہ موسوی مذہب کا کوئی نام رکھا گیا اور نہ عیسوی مذہب کا۔ بلکہ اُن کے پیروؤں کو بھی کبھی اپنا نام نہ سوجھا۔ مگر یہاں یہ بتایا گیا ہے

[1] الحج: ۷۹

کہ خدا خود نام رکھیگا - اور یہ بات صرف اسلام میں ہی پائی جاتی ہے -

دوسری بات یہ بتائی کہ اُس کی قوم کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی - چنانچہ آتا ہے کہ وہ قوم حفیظاہ کہلائیگی - یہ عبرانی لفظ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تم سے راضی ہُوا - اور قرآن کریم میں آتا ہے - وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (توبہ :۱۰۰) یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانیوالے وہ جو ابتداء میں ہی جلد ایمان لے آئے اور مہاجرین اور انصار بھی جو بعد میں آئے - اللہ اُن سے راضی ہُوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے - گویا قرآن صرف یہی نہیں کہتا کہ خدا مسلمانوں سے خوش ہُوا بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ بھی خدا سے خوش ہوئے -

تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اُس کا گھر بعولاہ کہلائیگا - یعنی اُس کی حفاظت کی جائیگی اور اُس کی زمین خاوند والی کہلائیگی - یعنی کبھی تباہ نہ ہوگی - اس کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ[1] فرمایا ہم قسم کھا کر کہتے ہیں طور کی یعنی طور کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کتاب کو بھی بطور شہادت پیش کرتے ہیں - جو لکھی ہوئی ہے اور ہمیشہ لکھی جائیگی - اور اس خانہ کعبہ کی بھی قسم کھاتے ہیں جو ہمیشہ معمور رہیگا اور دُور دُور سے لوگ اس کی طرف آتے رہیں گے - اور اس چھت کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ہمیشہ بلند رہے گی - یعنی اس کی عزت ہمیشہ قائم رہے گی -

گویا بتایا کہ نہ صرف یہ گھر ہمیشہ معمور رہیگا اور کروڑوں انسان اس سے تعلق رکھیں گے بلکہ بلند و بالا لوگ تعلق رکھیں گے - اور اس کی عزت قیامت تک قائم رہے گی - غرض قرآن نے یہ خبر دی کہ بیت اللہ قائم رہے گا - اِس سے اعلیٰ درجہ کے لوگ تعلق رکھیں گے اور مکّہ سے تعلق رکھنے والی کتاب کا چشمہ کبھی ختم نہ ہوگا -

چوتھی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ قوم ہمیشہ مقدس کہلائیگی - قرآن کریم کا یہ بھی دعویٰ ہے

[1] الطور : ۲ تا ۷

چنانچہ فرمایا۔ بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ۝ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ۝ (عبس آیت ۱۶-۱۷) یہ قرآن ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہیگا جو بڑے معزز اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہونگے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ بعض اوقات خرابی بھی تو آسکتی ہے۔ پھر یہ کتاب ہمیشہ مقدس لوگوں کے ہاتھ میں کیسے رہی۔ سو قرآن نے اس کا جواب بھی دے دیا۔ کہ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ [1] فرمایا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا نے اُمیوں میں رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ وہ ان کو اللہ کی آیتیں سُنائے اور پاک کرے اور کتاب کی تعلیم دے اور حکمت سکھائے۔ اس کے بعد جب مسلمانوں میں خرابی پیدا ہوگی۔ تو وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ خدا اس رسول کو ایک دوسری قوم میں بھیجیگا جو ابھی تک ان سے ملی نہیں گویا یہ قوم ہمیشہ مقدس کہلائیگی۔ کیونکہ اس میں اصلاح کرنے والے آتے رہیں گے۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خداوند کے چھڑائے ہوئے کہلائیں گے۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ [2] یعنی دنیا کی گردنوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم نے اس لئے بھیجا ہے کہ اُن بیڑیوں کو کاٹ دے اور لوگوں کو ان بندھنوں سے نجات دے۔ اس طرح وہ چھڑائے ہوئے کہلائیں گے۔

چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بستی مطلوبہ کہلائے گی۔ قرآن کریم بھی فرماتا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا (آل عمران: ۹۸) یعنی قیامت تک کے لئے یہ بات مقرر کر دی گئی ہے کہ جسے طاقت ہو وہ اِس بستی میں جائے اور حج کرے کہ یہ بستی مطلوبہ ہے۔

---

[1] الجمعۃ: ۳ و ۴ [2] الاعراف: ۱۵۸

حبقوق نبی کی پیشگوئی

پھر ہم اور آگے چلتے ہیں۔ تو حبقوق نبی فرماتے ہیں :-

"خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا۔ سلاہ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی۔ مری اس کے آگے آگے چلی اور اُس کے قدموں پر آتشی وبا روانہ ہوئی۔ وہ کھڑا ہوا۔ اور اُس نے زمین کو لرزا دیا۔ اس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا۔ اور قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پرانی پہاڑیاں اس کے آگے دھس گئیں۔ اُس کی قدیم راہیں یہی ہیں۔ مَیں نے دیکھا کہ کوشان کے خیموں پر آفت تھی۔ اور زمینِ مدیان کے پردے کانپ جاتے تھے۔ سورج اور چاند اپنے اپنے مکان میں ٹھہر گئے۔ تیرے تیروں کی روشنی کے باعث جو اڑے اور تیرے بھالے کی چمکاہٹ کے سبب تو قہر کے ساتھ زمین پر کوچ کر گیا۔ تُو نے نہایت غصّے ہو کے قوموں کو روند ڈالا ہے۔ تُو اپنی قوم کو رہائی دینے کے لئے ہاں اپنی ممسوح کو رہائی دینے کے لئے نکل چلا۔ تو بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ تو نے اس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُسی کے بھالوں سے مار ڈالا۔ وہ مجھے پراگندہ کرنے کو آندھی کی طرح نکل آئے۔ اُن کا فخر یہ تھا کہ مسکینوں کو ہم چپکے نگل جائیں ہر چند انجیر کا درخت نہ پھولے اور تاکوں میں میوے نہ لگیں تس پر بھی خداوند کی یاد میں خوشی کرونگا۔ مَیں اپنی نجات کے خدا کے سبب خوش وقت ہونگا"۔

(حبقوق باب ۳)

اس میں پہلی پیشگوئی تو یہ کی گئی ہے کہ خدا تیمان سے ظاہر ہوا۔ تیمان کے معنے عبرانی مفسّر جنوب کی سرزمین کے کرتے ہیں۔ اور عرب فلسطین سے جنوب کی طرف ہی ہے۔ لیکن عرب لوگ ایک وادی کو وادیٔ تہامہ کہتے ہیں اور مکّہ کو اس وادیٔ تہامہ میں شامل سمجھتے ہیں۔

قاموس میں لکھا ہے۔ و تهامة بالكسر مكة شرفها الله تعالىٰ وارض معروفة ۔یعنی تہامہ سے مراد مکّہ مکرمہ ہے اللہ تعالیٰ اس کے شرف کو بڑھائے اور ایک معروف زمین بھی ہے۔

تاج العروس میں لکھا ہے۔ ومن اسمائه صلی الله علیه وسلم التهامی لكونه ولد بمكة ۔یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں میں سے ایک نام تہامی بھی ہے کیونکہ آپ کی ولادت مکّہ میں ہوئی۔ بائیبل والے تیمان کو صرف جنوبی علاقہ قرار دیتے ہیں اور تیما کو حضرت اسمٰعیلؑ کا ایک بیٹا قرار دیتے ہیں جو عرب میں آباد تھا۔ پس گو وہ مکّہ کو تہامہ نہ قرار دیں لیکن عرب کا ایک حصّہ ہونے سے انہیں بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک وقت ایک قوم ایک جگہ آباد ہو۔ اور پھر اُٹھکر ذرا ہٹ کر دوسری جگہ بس گئی ہو۔

دوسرے یہ ذکر ہے کہ وہ فاران سے ظاہر ہوا۔ اور فاران بھی حضرت اسمٰعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام ہے اور وہ بھی عرب میں تھا۔ اُن کے علاقہ کو یوروپین جغرافیہ والے تسلیم کرتے ہیں کہ عرب میں تھا گو اسے بھی فلسطین کے پاس پاس بتاتے ہیں۔ لیکن اس بارہ میں خود عربوں کی شہادت زیادہ معتبر تسلیم کی جائیگی بہ نسبت دوسری قوموں کے۔ اور عرب لوگ مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منوّرہ کے درمیانی جنگل کو برّیۂ فاران کہتے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وادیٔ فاطمہ نامی پڑاؤ پر اگر بنجۂ مریم بیچنے والوں سے پوچھا جائے کہ تم یہ کہاں سے لائے ہو تو یہی کہتے ہیں کہ ہم برّیہ فاران یعنی دشتِ فاران سے لائے ہیں۔ تاج العروس میں لکھا ہے وفی الحدیث ذکر جبال فاران وهو اسم لجبال مكة بالعبرانی کہ حدیث میں فاران کے پہاڑوں کا جو ذکر آتا ہے۔ اس سے مراد مکّہ کی پہاڑیاں ہیں اور یہ نام عبرانی زبان میں مستعمل ہے۔

پھر دوسری اور تیسری پیشگوئی یہ ہے کہ آسمان اُس کی شوکت سے چھپ گیا۔ اور زمین اُس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے پوری ہوئی چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (احزاب ع ۷ : ۵۷) یعنی اللہ اور اُس کے

ملائکہ اِس نبی پر آسمان سے درود بھیج رہے ہیں۔ اِس لئے اے مومنو! تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو۔ گویا آسمان آپ کی شوکت سے چھپ گیا۔ حدیث میں آتا ہے۔ آسمان میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں۔ جہاں ملائکہ نہ ہوں۔ اور چونکہ سب کے سب ملائکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج رہے ہیں۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شوکت سے سارا آسمان چھپ گیا۔ آگے بتایا کہ ہم نے بھی زمین کو اُس کی حمد سے معمور کرنا ہے اِس لئے اے مسلمانو! اب تمہارا کام ہے کہ تم اس نبی پر درود و سلام بھیجو۔ آسمان کی شوکت کے متعلق ہمارا کام تھا۔ وہ ہم نے کر دیا۔ اب زمین کو حمد سے معمور کرنا تمہارے سپرد ہے۔ تم اُٹھتے بیٹھتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجو۔ اور اِس طرح صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا پر عمل کرو۔ غرض دونوں باتیں پوری ہوگئیں۔ آسمان سے فرشتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اور زمین پر مسلمان۔ اور پھر زمین کا وہ کونسا حصّہ ہے جہاں مسلمان نہیں ہیں۔ اِس طرح زمین بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمد سے معمور ہوگئی۔

چوتھی پیشگوئی یہ بیان کی کہ مری اس کے آگے آگے چلی۔ اِس کے معنے یہ ہیں۔ کہ جدھر اُس نے توجہ کی اُدھر ہی دشمن ہلاک ہوگئے۔ یہ پیشگوئی حضرت عیسیٰؑ پر چسپاں نہیں ہوسکتی کیونکہ مری اُن کے آگے نہ چلی بلکہ بقول عیسائیاں وہ مری کے آگے چلے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ وہ دشمنوں سے بچائے گئے۔ لیکن عیسائی کہتے ہیں اُن کے دشمنوں نے انہیں صلیب پر مار دیا

پانچویں پیشگوئی یہ کی گئی ہے کہ اُس کے قدموں پر آتشی وبا روانہ ہوئی۔ بائیبل کے مفسّر کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں جائیگا وبا آئیگی۔ مگر خدا کے کسی مقدس کی یہ علامت نہیں ہوتی۔ بعض بائیبل کے نسخوں میں خصوصًا عربی نسخوں میں لکھا ہے۔ وعند رجلیہ خَرَجَتِ الْحُمّٰی کہ اس کے پاؤں کے پاس سے بخار نکل گیا۔ یعنی جہاں اُس کا پاؤں پڑیگا وہاں سے بخار نکل جائیگا۔ گویا آتشی وبار سے مراد بخار ہے۔ یہ بات بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے متعلق نہایت وضاحت سے پوری ہوئی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بخار کی بڑی شدت تھی۔ حتّٰی کہ اسے یثرب اسی لئے کہتے تھے کہ وہاں ملیریا بخار بڑی شدت سے ہوتا تھا۔ جب صحابہؓ وہاں ہجرت کر کے گئے تو سب کو بخار آنے لگا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ قرآن کریم میں بھی مدینہ کا نام یثرب آتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (احزاب: ۱۴) اور یثرب کے معنے عیب اور ہلاکت کے ہیں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے گئے اور صحابہؓ بخار سے بیمار ہو گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اور آپؐ نے یہ دُعا کی کہ اللھم العن شیبة بن ربیعة و عتبة بن ربیعة و امیه بن خلف کما اخرجونا من ارضنا الی ارض الوباء۔ اے خدا! شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کو تباہ کر جنہوں نے ہمیں مکّہ کی زمین سے نکال کر بخار کی سرزمین میں پہنچا دیا۔ پھر فرمایا۔ صححها لنا و انقل حُمّاها الی الجحفة (بخاری ابواب فضائل المدینة باب کراهیة النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان تعری المدینة یعنی اے خدا! میں دُعا کرتا ہوں کہ تو یہاں سے بخار کو نکال دے اور جُحفہ کی طرف بھیجدے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد مدینہ سے بخار دُور ہو گیا۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اب اسے یثرب نہ کہو کیونکہ اس میں عیب اور سزا اور ڈانٹ کے معنے پائے جاتے ہیں بلکہ اسے طیبہ کہو۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لے جانے سے وہاں سے بخار نکل گیا۔ اور اس کی ہوا آج تک نہایت اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔ یہ خبر تھی جو اس پیشگوئی میں دی گئی تھی۔

چھٹی پیشگوئی یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ کھڑا ہوا اور اُس نے زمین کو لرزا دیا۔"

اس کے ایک تو ظاہری معنے ہیں۔ وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو حلیہ لکھا گیا ہے

اس میں ایک بات یہ بیان کی گئی ہے کہ اذا مشی تقلع کانما ینحط من صبب۔ جب آپ چلتے تو آپ کا پاؤں زمین پر اس طرح پڑتا کہ گویا پاؤں دھنس گیا ہے۔

دوسرے معنے لرزانے کے یہ ہیں کہ آپ کا بے حد رُعب تھا۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ نصرت بالرعب مسیرۃ شھر۔ یعنی ایک ایک مہینہ کے فاصلہ تک کے لوگ آپ کے رعب سے لرزتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی یہ ذکر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۫ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَ اَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۫ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ (حشر: ۳) فرمایا۔ وہ خدا ہی ہے جس نے اہل کتاب کے کفار کو اُن کے گھروں سے نکالا۔ تمہیں گمان تک نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے۔ وہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے قلعے ہمیں بچا لیں گے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُعب نے اُن کو تباہ کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو تباہ کرنے لگے۔ اور وہ بھاگ گئے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ طاقت عطا کی کہ جہاں دشمن کے مقابلہ کے لئے جاتے لوگ آپ کے رعب سے لرز جاتے۔

ساتویں پیشگوئی یہ بیان کی گئی ہے کہ "اُس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیں اُس پر چڑھ آئیں گی۔ لیکن جب وہ مقابلہ کرے گا تو بھاگ جائینگی۔ جنگ احزاب کے موقعہ پر ایسا ہی ہوا جس کے متعلق سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ[1] میں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ کہ قومیں جمع ہو کر حملہ کرینگی مگر پھر بھاگ جائیں گی۔

آٹھویں پیشگوئی یہ کی گئی کہ "قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پرانی پہاڑیاں اُس کے آگے دھنس گئیں"۔ پہاڑ سے مراد بڑے بڑے آدمی بادشاہ اور حکمران ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں جب قیصر و کسریٰ آئے تو کس طرح اُن کا نام و نشان مٹ گیا

[1] القمر: ۴۶

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (الطور: ۸ تا ۱۲) کہ ہم اسلام کی ترقی کے متعلق جن باتوں کی خبریں دے رہے ہیں وہ ہو کر رہیں گی۔ کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔ جب آسمان لرزہ کھا کر پھٹ جائیگا۔ اور پہاڑ اپنی پوری رفتار کے ساتھ چلیں گے۔ اُس دن جھٹلانے والوں پر خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ گویا قرآن بھی اس پیشگوئی کی تائید کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے لوگوں کو بھی حقیقی نبی کی اس پیشگوئی کا خیال تھا۔ کیونکہ قرآن کریم میں قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝ مَّنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا (طٰہٰ: ۱۰۰ تا ۱۰۱) کہ ہم نے تمہیں یہ قرآن دیا ہے۔ جو اس کا انکار کرے گا قیامت کے دن سزا پائیگا۔ اس کے بعد فرماتا ہے:۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (طٰہٰ: ۱۰۶ تا ۱۰۹) یعنی کہتے ہیں کہ پہاڑوں کا کیا حال ہوگا تو کہہ دے کہ میرا رب ان کو اکھیڑ کر پھینک دیگا اور ان کو ایک ایسے چٹیل میدان کی صورت میں چھوڑ دے گا کہ نہ تو اس میں کوئی موڑ دیکھیگا اور نہ کوئی اونچائی۔ اُس دن لوگ سچے امام کے پیچھے چل پڑیں گے۔ جس کی تعلیم میں کوئی کجی نہ ہوگی۔ اور آوازیں خدائے رحمان کے لئے دب جائیں گی۔ یعنی ادب والی آواز کے سوا تم کوئی اور آواز نہ سنو گے۔

مفسرین کہتے ہیں ان آیات کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ اڑائے جائیں گے مگر یہاں پہلے قیامت کا ذکر آچکا ہے جس میں بتایا ہے کہ اُس وقت زمین و آسمان نہ رہیں گے۔ اور جب زمین و آسمان نہ رہیں گے تو پھر پہاڑوں کے علیحدہ ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ تو اُس کے متعلق

سوال کیا گیا کہ یہ اتنی بڑی بڑی موجودہ حکومتیں کہاں جائیں گی۔ اس کے جواب میں بتایا کہ تباہ ہو جائیں گی۔ پھر یَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ بھی بتاتا ہے کہ یہاں مراد اگلا جہان نہیں۔ کیونکہ مومن تو اس جہان میں بھی ایسے داعی کے پیچھے ہوتے ہیں اور کافروں کے متعلق آتا ہے کہ وہ آخرت میں ساتھ جانا چاہیں گے تو انہیں واپس کردیا جائیگا۔ اور پھر فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل: ۷۳) کہ جو اس دنیا میں اندھا ہے۔ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ اُس وقت کفار کہاں ایمان لائیں گے وہ تو وہاں بھی گمراہ ہی ہونگے۔ پھر داعی کے پیچھے کیونکر چلیں گے۔ پس مراد یہی ہے کہ ان حکومتوں کو تباہ کردیا جائے گا۔ اور جو لوگ اس وقت دشمن ہیں وہ ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہوا تو سارے دشمن ایمان لے آئے۔ پس جبال سے مراد بڑے آدمی اور سرداران قوم اور سلاطین ہیں کہ جن کے مارے جانے اور جن کے نظام کو توڑ دیئے جانے پر اسلام کی اشاعت مقدر تھی۔

نویں پیشگوئی یہ بیان کی گئی کہ " میں نے دیکھا کہ کوشان کے خیموں پر بپت تھی اور زمین مدیان کے پردے کانپ جاتے تھے۔" عربی بائیبل میں بپت کی جگہ بلیہ یعنی مصیبت لکھا ہے اور پردے کانپ جاتے تھے کی جگہ انگریزی میں Did tremble کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کوشان کیا ہے۔ بائیبل والے کہتے ہیں کہ کوشان کے معنے کوش میں رہنے والا قبیلہ ہے جو عراق عرب کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ بائیبل میں یہ بھی لکھا ہے کہ نمرود کے باپ کا نام کوش تھا۔ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ کوش قبیلہ کے لوگ چھ سو سال تک عراق پر حکومت کرتے رہے۔ مدیان شمالی عرب کا ساحل سمندر کے پاس کا ایک شہر ہے جو مصر سے شام یا عرب کو جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے۔ قرآن کریم میں اُسے مدین کہا گیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ حکومت قیصر میں شامل تھا اور شام کے صوبہ کے نیچے تھا۔ ان دونوں ملکوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حملہ ہوا اور دونوں حکومتوں کو تباہ کرکے

اسلامی حکومت قائم کر دی گئی - اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتح درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی فتح تھی - کیونکہ آپ نے فرمایا - قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں مجھے دی گئی ہیں - اور جنگ احزاب کے موقع کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک پتھر نہیں ٹوٹتا تھا صحابہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آکر عرض کی کہ ایک پتھر نہیں ٹوٹتا - آپؐ تشریف لائے - فقال بسم اللہ ثم ضربه فنثر ثلثها وقال الله اكبر اعطيت مفاتيح الشام والله انى لابصر قصورها الحمر الساعة ثم ضرب الثانية فقطع ثلثاً اخر فقال الله اكبر اعطيت مفاتيح فارس والله انى لابصر قصور المدائن الابيض الآن ثم ضرب الثالثه وقال بسم الله فقطع بقية الحجر فقال الله اكبر اعطيت مفاتيح اليمن والله انى لابصر ابواب صنعاء من مكانى الساعة (مسند احمد بن حنبل و نسائی بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ و ۱۰۹) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر کدال اپنے ہاتھ میں لی اور اُسے زور سے پتھر پر مارا - تو اس میں سے آگ کا ایک شعلہ نکلا اور پتھر کا تیسرا حصّہ ٹوٹ گیا - اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا - اور فرمایا اللہ اکبر - مجھے حکومت شام کی کنجیاں دے دی گئی ہیں اور خدا کی قسم مَیں اُس کے سُرخ محلات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں - پھر دوسری دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کدال کو پتھر پر مارا تو پھر اُس میں سے ایک شعلہ نکلا اور پتھر کا ایک اور حصّہ ٹوٹ گیا - اِس پر پھر آپؐ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا اللہ اکبر - مجھے ایران کی کُنجیاں بھی دے دی گئی ہیں اور خدا کی قسم میں مدائن کے سفید محلات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں - پھر آپ نے تیسری دفعہ کدال ماری جس سے پھر اُس میں سے ایک شعلہ نکلا اور باقی پتھر بھی ٹوٹ گیا - اس پر آپ نے پھر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا اللہ اکبر - مجھے یمن کی کنجیاں بھی دیدی گئی ہیں اور خدا کی قسم مَیں صنعاء کے دروازے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں -

غرض حبقوق نبی کی پیشگوئی میں یہ خبر دی گئی تھی کہ آنے والا شام - عراق اور مدائن کو فتح کریگا - قرآن کریم بھی اِن جنگوں کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتا ہے :- قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ

مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (سورۂ فتح :۱۷) یعنی اعراب میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑے گئے ہیں تو اُن سے کہدے کہ تم ضرور ایک ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لئے بلائے جاؤ گے جو فنون جنگ میں بڑی ماہر ہے اور تم اُن سے اُس وقت تک جنگ جاری رکھو گے جب تک کہ وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور نہ ہو جائیں اور مسلمان نہ ہو جائیں۔ پس اگر تم اُس وقت خدا کی آواز پر لبیک کہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بڑا اچھا اجر دیگا۔ اور اگر تم اس حکم سے روگردانی اختیار کرو گے جس طرح تم نے اِس سے پہلے روگردانی کی تھی تو اللہ تعالیٰ تم کو دردناک عذاب دے گا۔

اِس آیت میں یہ خبر دی گئی تھی کہ اَب عرب کی جنگ تو ختم ہوئی اب باہر سے اَور قومیں آئیں گی جو ان سے بھی زیادہ لڑنے والی ہونگی اور اُن سے تمہارا مقابلہ ہو گا۔ مگر ان جنگوں کا بھی آخری نتیجہ یہی ہو گا کہ وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ عرب سے باہر بھی جنگیں ہونی ضروری تھیں۔ چنانچہ قیصر و کسریٰ کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگیں ہوئیں۔ اور خدا تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ بخشا۔

دسویں پیشگوئی یہ بیان کی گئی ہے کہ " سورج اور چاند اپنے اپنے مکان میں ٹھہر گئے۔ تیرے تیروں کی روشنی کے باعث جو اُڑے اور تیرے بھالے کی چمکاہٹ کے سبب۔ تو قہر کے ساتھ زمین پر کوچ کرے گا۔ تو نے نہایت غصے ہو کر قوموں کو روند ڈالا ہے۔"

سورج اور چاند کا ٹھہر جانا یہ محاورہ ہے رُوحانی اور جسمانی سلسلوں کے نظام کے ٹوٹ جانے کا۔ سورج دنیوی اور چاند رُوحانی سلسلوں کا نشان ہے۔ جب خیبر فتح ہُوا اور حضرت صفیہؓ کی شادی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی۔ تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔ مجھے پہلے ہی بتایا گیا تھا کہ میری شادی آپؐ سے ہو گی۔ آپؐ نے فرمایا۔ کس طرح؟ انہوں نے کہا۔ مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ چاند میری گود میں

آ گرا ہے۔ اِس کا ذکر مَیں نے اپنے باپ سے کیا۔ تو اُس نے مجھے تھپڑ مارا اور کہا تو عرب کے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ پس چاند سے مراد مذہبی حکومت ہے اور سورج سے مراد دنیوی حکومت۔ مطلب یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے رُوحانی اور جسمانی دونوں نظام ٹوٹ جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوُا۔ دونوں سابقہ نظام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ٹوٹ گئے۔ رُوحانی طور پر سب فیض آپؐ کے سلسلہ کے بعد بند ہوگئے۔ اور جسمانی طور پر آپؐ کے اتباع نے سب حکومتوں کو خواہ کسی ملک کی تھیں تباہ کر دیا۔ اور دنیا کا نظام ہی بدل ڈالا۔ بائیبل کی اگلی آیت اِسی کی تفسیر ہے۔

گیارھویں پیشگوئی یہ کی گئی ہے کہ "تو اپنی قوم کو رہائی دینے کے لئے ہاں اپنی ممسوح کو رہائی دینے کے لئے نکل چلا۔ تو بنیاد کو گردن تک ننگا کرکے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ تُو نے اُس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُسی کے بھالوں سے مار ڈالا۔ وہ مجھے پراگندہ کرنے کے لئے آندھی کی طرح نکل آئے۔ اُن کا فخر یہ تھا کہ مسکینوں کو ہم چپکے نگل جائیں۔"

اِس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ موعود جنگ کے لئے نکلیگا تاکہ اپنی کمزور قوم کو ظالموں سے رہائی دلائے۔ اور اِس میں یہ بھی بتایا کہ دشمن بھی جنگ کے لئے نکلیگا کیونکہ لکھا ہے کہ "وہ پراگندہ کرنے کے لئے آندھی کی طرح نکل آئے۔" گویا اِدھر سے یہ اور اُدھر سے وہ نکلیں گے۔ اور دونوں کی مڈبھیڑ ہوگی۔ دشمن چاہیگا کہ غریب اور کمزور قوم کو دھوکا سے تباہ کردے۔ مگر وہ خود تباہ ہوگا۔ اور موعود کامیاب ہوگا۔

اب دیکھو کتنی تفصیل سے اِس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اور بدر کی جنگ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مکّہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ کے لئے عُتبہ کی کمان میں نکلے۔ ابوجہل سیکنڈ اِن کمان تھا۔ جب عُتبہ مارا گیا۔ تو ابوجہل نے کمان سنبھال لی۔ غرض مکّہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے ماننے والوں کو

تباہ کرنے کے لئے نکلے۔ ادھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اُن کے ارادہ کا علم ہوا تو آپ بھی نکلے تاکہ دشمن مدینہ پر حملہ کرکے مدینہ کو تباہ نہ کر سکے۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (نساء: ۷۶) فرمایا۔ اے مسلمانو! اللہ کے رستہ میں لڑائی کرنے میں تمہیں کیا عذر ہو سکتا ہے جبکہ کچھ کمزور مرد۔ عورتیں اور بچے ہم سے دُعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس ظالم بستی سے نکال اور ہماری امداد کے لئے کسی کو کھڑا کر۔ آگے فرماتا ہے۔ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ وَاللّٰهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا (نساء: ۸۵) یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو اکیلا کھڑا ہو۔ کوئی اور جائے یا نہ جائے تو چل۔ ہاں مسلمانوں کو تحریص دلا۔ اگر وہ شامل ہو جائیں تو ثواب کے مستحق ہونگے۔ نہیں تو عذاب کے۔ مگر تو ضرور چل۔

اس پیشگوئی میں یہ بھی ذکر تھا کہ وہ فخر سے نکلے اور چوری چھپے کمزوروں پر حملہ کرکے انہیں تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (انفال: ۴۸) یعنی اے مسلمانو! بدر کے موقعہ پر نکلنے والے کفّار کی طرح نہ بنو۔ جو اِتراتے ہوئے نکلے تھے۔ پھر وہ ظاہر کچھ دکھاتے تھے اور اندر سے اُن کی نیت اَور تھی۔ ظاہر تو یہ کرتے تھے کہ ایک قافلہ کو بچانے چلے ہیں۔ مگر اُن کی نیّت مدینہ منوّرہ کو تباہ کرنے کی تھی۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ قافلہ کو لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔ اگر یہی بات تھی اور کفار اس قافلہ کو بچانے چلے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ وہ تکبّر کرتے نکلے اور پھر یہ کہ کہتے کچھ تھے اور اُن کا اندرونی منشا کچھ اَور تھا۔

وہ چاہتے یہ تھے کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں۔ بھلا قافلہ کو بچانے سے اسلام کو کیا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ بائیبل کہتی ہے کہ دشمن چوری سے نکلے اور اُن کی غرض یہ تھی کہ چپکے سے اس قوم کو جو کمزور تھی تباہ کر دیں۔ اور قرآن بھی اُن کی غرض یصدّون عن سبیل اللّٰہ بیان کر کے بائیبل کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن مؤرخ کہتے ہیں کہ کفار صرف اپنے ایک قافلہ کو بچانے کی غرض سے نکلے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلہ کو لوٹنے کیلئے آئے تھے۔ بائیبل اور قرآن دونوں کا بیان ایک ہے اور مؤرخ جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ کفار نے قافلہ کو بچانے کا صرف بہانہ بنایا تھا۔ ان کی غرض مدینہ پر حملہ کرنا تھی تاکہ مسلمانوں کو تباہ کر دیں۔

ابوجہل کے قتل کئے جانے کی پیشگوئی جو بڑی شان سے پوری ہوئی

بارھویں پیشگوئی۔ اب اس پیشگوئی کے درمیان کے دو فقرے جنہیں میں نے چھوڑ دیا تھا اُن کا ذکر کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں۔ "تو بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ تُو نے اُس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُس کے بھالوں سے مار ڈالا۔"

اس پیشگوئی میں اس قدر استعارہ استعمال کیا گیا ہے کہ بظاہر مضمون کا سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معنے کھل جاتے ہیں۔ یہ تو صاف بات ہے کہ بنیاد کی گردن کوئی نہیں ہوتی۔ نہ شریر کے گھر کا سر کوئی ہے۔ پس اس کے کوئی اَور معنے کرنے ہوں گے۔ سو ہم دوسرے حصّہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اس کی تشریح موجود ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے سر سے مراد گھرانہ کا سردار ہے۔ جب یہ حل ہو گیا تو اب بنیاد کی گردن کو ننگا کرنا بھی آسان ہو گیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب اس پیشگوئی پر غور کیا جائے تو ہمیں اس کا پہلا فقرہ یہ نظر آتا ہے کہ "بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد کو گردن تک ننگا کرنے کے کیا معنے ہیں۔ بائیبل والے کہتے ہیں۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ بنیاد تک ننگا کر دے۔ مگر جب بنیاد کا لفظ موجود تھا تو پھر گردن تک کہنے کے کیا معنے۔ اور بنیاد کی گردن کا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ جب گردن کا ذکر ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ کسی انسان کے متعلق ہے۔ اور بنیاد عام محاورہ میں اس نیچے کی چیز کو کہتے ہیں جس پر کوئی چیز رکھی ہو۔ انگریزی میں Base عمارت کی بنیاد کو بھی کہتے ہیں اور سر کی جڑ کو بھی کہتے ہیں جہاں سر گردن سے ملتا ہے۔ عبرانی میں Base کا لفظ ہی ہے۔ پس سر کا نچلا حصہ چونکہ گردن پر رکھا ہوتا ہے اس لئے وہ بنیاد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ گردن تک نچلے حصّہ کو ننگا کیا جائے گا۔ پھر شریر کے گھر کے سر سے مراد گھرانہ کا سردار ہے۔ کیونکہ شریر کے گھر کا سر کوئی اور چیز نہیں ہوتی پس اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دشمن کے قبیلہ کے سردار کے سر کو گردن تک ننگا کرے گا۔ اور پھر اُسے جڑ سے کاٹ دیگا۔ ان معنوں کی اگلے فقرہ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ آگے آتا ہے۔ "تو نے اُس کے سرداروں میں سے جو عالی درجہ کا تھا اس کے بھالوں سے مار ڈالا"۔ اس فقرہ سے معلوم ہوا کہ پہلے فقرہ میں کسی دشمن کے قتل کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ پس بنیاد کو گردن تک ننگا کرنے کے معنے یقیناً سر کو گدی تک ننگا کرنے کے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ جب وہ نبی کمزوروں کو بچانے کے لئے ایک طرف سے نکلا۔ اور دوسری طرف سے اس کے دشمن غریبوں کو مسل ڈالنے کے خیال پر فخر کرتے ہوئے نکلے تو آپس میں جنگ ہوئی۔ اور اس جنگ میں جو دشمنوں کا سردار تھا اُسے اُس نبی یا اس کے کسی تابع نے گردن تک ننگا کر کے اُسی کے ہتھیار سے مار ڈالا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا بدر کی جنگ میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کوئی ایسا واقعہ ہوا کہ کسی سردار کے سر کو اُس کی گردن ننگی کر کے گدی سے کاٹ دیا گیا ہو۔ جب ہم بدر کی جنگ کا حال پڑھتے ہیں۔ تو ہمیں لفظ بلفظ ایسا ہی ایک واقعہ ملتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے جب جنگ شروع ہوئی اور صحابہ مقابل پر کھڑے ہوئے۔ تو اُن میں دو کم سن لڑکے بھی تھے۔ یہ جنگی قاعدہ ہے کہ بہادر لڑنے والے اس بات کی احتیاط رکھتے ہیں کہ اُن کے

دائیں بائیں بھی بہادر ہوں تاکہ وہ پوری بے فکری سے جنگ میں نمایاں حصّہ لے سکیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ ہمارے دل کفار کی تکالیف سے بھرے ہوئے تھے۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ آج ان سے خوب بدلہ لیں گے۔ مگر جب مَیں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ دو لڑکے کھڑے ہیں تو میرا دل بیٹھ گیا کہ آج کیا لڑنا ہے جبکہ دونوں پہلو اتنے کمزور ہیں۔ لیکن ابھی یہ خیال میرے دل میں آیا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے مجھے کہنی ماری اور میرے کان میں آہستہ سے تاکہ دوسرا لڑکا نہ سُن لے کہا۔ چچا سُنا ہے ابوجہل بڑا شریر ہے مسلمانوں کو بہت دُکھ دیتا ہے وہ کونسا ہے۔ مَیں اُسے مارنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔ باوجود اس بہادری کے جو مَیں رکھتا تھا مجھے یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ مَیں ابوجہل کو ماروں۔ لیکن ابھی وہ لڑکا مجھ سے بات کر ہی رہا تھا کہ دوسرے نے مجھے کہنی ماری اور چپکے سے پوچھا۔ چچا وہ ابوجہل کون ہے جو مسلمانوں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں اُسے ماروں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ مَیں اُن کی بات سُن کر سخت حیران ہوا۔ ابھی تھوڑی سی جنگ ہوئی تھی کہ عتبہ مارا گیا اور ابوجہل کمانڈر بنا تھا۔ مَیں نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔ وہ ابوجہل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا اشارہ کرنا تھا کہ دونوں لڑکے چیل کی طرح جھپٹا مار کر پہرہ میں سے گذرتے ہوئے اُس پر جا پڑے اور اُسے گرا دیا۔ پہرہ کے سپاہیوں نے اُن پر حملہ کیا اور ایک کا ہاتھ کاٹ دیا جو تسمہ سے لٹک رہا تھا۔ اُس نے اُس پر پاؤں رکھ کر اُسے علیحدہ کر دیا تاکہ لڑائی میں حارج نہ ہو۔

ابوجہل گر گیا تھا اور اُسے زخم آئے تھے مگر مرا نہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پوچھا کہ ابوجہل کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تو عبداللہ بن مسعودؓ اس کا پتہ لگانے کے لئے نکلے۔ جب وہ گئے تو دیکھا کہ ابوجہل گرا پڑا ہے۔ انہوں نے اُسے کہا اے دشمنِ خدا۔ آج بھی تُو ذلیل ہوا ہے یا نہیں۔ اُس نے جواب دیا۔ ایک سردار قوم کو اس کی قوم مار دے تو اس میں کیا ذلت ہے۔ انہوں نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن چونکہ اُن کی تلوار چھوٹی تھی۔ اور

اُس کے پاس بھی تلوار تھی۔ اِس لئے کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر اُس کے ہاتھ پر اُن کی تلوار لگی۔ اور اُس کی تلوار گر گئی۔ انہوں نے اُس کی تلوار اُٹھا لی اور اُسے مارنے لگے۔ اُس نے کہا۔ دیکھ میں سردار قوم ہوں۔ میری گردن لمبی کر کے کاٹنا۔ تاکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے دیکھ کر ڈرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اِس سے اَور زیادہ غصہ آیا۔ اونہوں نے پیچھے سے ہو کر اُس کی گردن پکڑ لی اور اُس کا خود اٹھا کر سر کے عین نیچے سے اُس کی گردن کو ننگا کیا۔ اور اُسی کی تلوار سے اُس کا سر کاٹ دیا۔ اور اِس طرح اُس کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ اور حبقوق نبی کی یہ پیشگوئی کہ "تو بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو پھل ڈالتا ہے۔ تُو نے اُس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُسی کے بھالوں سے مار ڈالا" لفظاً لفظاً پوری ہوئی۔

اب دو سوال باقی رہتے ہیں۔ ایک یہ کہ پیشگوئی میں ہے کہ تُو نے دشمن کو مارا لیکن مارا عبداللہ بن مسعودؓ نے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ نبی کے متبع کا کام درحقیقت رسول کا ہی ہوتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ پیشگوئی میں بھالا آیا ہے مگر عبداللہ بن مسعودؓ نے تلوار سے مارا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اردو بائیبل میں بھالا لکھا ہے۔ انگریزی میں ٹیڑھی لکڑی۔ فارسی میں سونٹا اور عربی میں تیر۔ اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبرانی لفظ کے معنے نہ بھالا ہیں۔ نہ تیر۔ نہ سونٹا بلکہ ہتھیار کے ہیں جس کا ترجمہ مختلف مترجموں نے مختلف کر دیا ہے۔ یہ میرا خیال ہی نہیں بائیبل کا ایک مفسر بھی تفسیر بائیبل میں لکھتا ہے :-

This were later translated than didst smite through with his own weapons the head of his chieftains.

یعنی صحیح مطلب یہ ہے کہ اُسی کے ہتھیار سے اس کی گردن کاٹ دی۔

تیرھویں پیشگوئی یہ تھی کہ "ہر چند کہ انجیر کا درخت نہ پھولے تس پر بھی میں خداوند کی یاد میں خوشی کرونگا" اِس میں بتایا کہ یہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا۔ بنی اسرائیل کی

مثال بائیبل میں انجیر سے دی گئی ہے۔ چنانچہ انجیل میں آتا ہے کہ مسیح نے ایک انجیر کے درخت پر لعنت کی کہ اُسے پھل نہ لگیں۔ (متی باب ۲۱ آیت ۱۹ و مرقس باب ۱۱ آیت ۱۲) اور اس کی تفسیر مسیحی مفسر یہی کرتے ہیں کہ یہودی قوم کا خدا سے تعلق کٹ جائے۔ پس اس کا مطلب یہ ہے کہ حبقوق نبی کہتا ہے کہ گو یہود جن میں سے وہ خود ہے تباہ ہو جائیں گے۔ لیکن پھر بھی مجھے اُس نبی کے ذریعہ خدا کے نام کا روشن ہونا اپنی قومی ترقی سے زیادہ پسند ہے اور میں اپنی قومی تباہی کو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والے جلال کی وجہ سے بخوشی برداشت کرونگا۔

حضرت مسیح ناصری کی پیشگوئی

اس کے بعد ہم کچھ اور صدیاں پیچھے چلتے ہیں جب کہ حضرت مسیح ناصری کا زمانہ آتا ہے۔ وہ انگورستان کی تمثیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"پس جب باغ کا مالک آئیگا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ انہوں نے اُس سے کہا۔ ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا۔ جو موسم پر اُس کو پھل دیں۔ یسوع نے اُن سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے ردّ کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائیگی۔ اور جو اس پتھر پر گریگا اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا۔" (متی باب ۲۱ آیت ۴۰ تا ۴۴)

دوسری جگہ حضرت مسیح فرماتے ہیں:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر

میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ، اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھیرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھوگے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اَور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا رُوح آئیگا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائیگا۔ اِس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا لیکن جو کچھ سُنیگا وہی کہیگا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اِس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کرکے تمہیں خبریں دے گا۔"

(یوحنا باب ۱۶ آیت ۷ تا ۱۴)

اِن پیشگوئیوں میں حضرت مسیح نے مندرجہ ذیل باتیں بتائی ہیں:-

اوّل یہ کہ ایک مثیلِ موسیٰ آئے گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا آنا ایک شرعی نبی کے آنے پر جو مثیل موسیٰ ہو دلالت کرتا ہے۔ (۲) یہ کہ وہ بنی اسرائیل سے نہ ہوگا (۳) یہ کہ اُس کی قوم میں ہمیشہ برگزیدہ لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو قوم کی ہدایت کا موجب ہوں گے۔ (۴) یہ کہ وہ موعود کونے کا پتھر ہوگا۔ یعنی اُس پر سب شریعتیں ختم ہو جائیں گی (۵) یہ کہ اُس کا مقابلہ دوسری اقوام سے ہوگا۔ لیکن خواہ اُس پر کوئی حملہ کرے یا وہ کسی پر حملہ کرے دونوں صورتوں میں وہ کامیاب رہیگا۔ (۶) یہ کہ وہ تسلّی دینے والا ہوگا (۷) یہ کہ وہ دنیا کو تین چیزوں سے تقصیروار ٹھیرائیگا۔ گناہ سے یعنی بوجہ مسیح کو نہ ماننے کے گناہ کے۔ وہ لوگوں پر الزام لگائیگا۔ یہاں گناہ محدود معنوں میں لیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ ایک قوم کو مسیح کے انکار کی وجہ سے اور دوسری کو راستی سے یعنی مسیح کو چھوڑ بیٹھنے کی وجہ سے۔

اور تیسری کو عدالت سے یعنی اس وجہ سے کہ وہ لوگ شیطان سے تعلق رکھتے ہوں گے قصوروار ٹھیرائیگا۔ گویا یہود انکار مسیح۔ نصاریٰ غلو در مسیح اور دیگر اقوام شیطانی تعلقات کی وجہ سے مجرم قرار دی جائینگی۔ اور سب ہی دنیا اس کے آنے پر مجرم قرار پائیگی۔ (۸) یہ کہ وہ ایسی باتیں کہیگا جو اُس سے پہلے نہ کہی گئی ہونگی۔ (۹) یہ کہ وہ سب سچائیاں بتائیگا جن کے بعد کسی اور سچائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ (۱۰) یہ کہ اُس کی کتاب میں صرف خدا کا کلام ہوگا اور وہ آئندہ کے لئے بھی روحانی ترقی کا رستہ کھلا رکھیگی۔ (۱۱) یہ کہ وہ کتاب مسیح کو عیب سے مبرّا کرے گی (۱۲) یہ کہ مسیح کے راستباز ہونے کا عملی ثبوت دے گی یعنی اس کے کلام کو پورا کرکے اُس کے باخدا ہونے کا ثبوت پیش کرے گی۔

یہ ساری کی ساری باتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہایت شان سے پوری ہوئیں۔ اوّل آپ مثیلِ موسیٰؑ تھے اور آپؐ نے دعویٰ کیا کہ آپؐ میں خدا ظاہر ہوا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (سورۃ فتح: ۱۱) یعنی وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری نہیں بلکہ خدا کی بیعت کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ موعود بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل میں سے نہ تھے بلکہ بنی اسمٰعیل میں سے تھے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ آپ کی قوم کی ہدایت کے سامان ہمیشہ ہوتے رہیں گے چنانچہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (جمعہ ع ۱) یعنی اللہ تعالیٰ اس رسول کو ایک دوسری قوم میں بھی بھیجیگا جو ابھی تک اِن سے ملی نہیں۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

پھر حدیثوں میں آتا ہے حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا (ابوداؤد جلد ۲ صـ۵۸۹) یعنی اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر اس اُمت میں تجدید دین

کے لئے اپنے پاک بندوں کو کھڑا کرتا رہیگا۔

چوتھی بات یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ موعود کونے کا پتھر ہوگا۔ جسے سب معماروں نے ردّ کر دیا۔ یہ اِس لحاظ سے بھی درست ہے کہ بنی اسرائیل ہمیشہ بنی اسمٰعیل کو محروم الارث قرار دیتے رہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دعویٰ کیا ہے کہ آپ کونے کا پتھر ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنیٰ بیتًا فاحسنه واجمله الّا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون له ویتعجبون له ویقولون هلا وُضعت هٰذه اللبنة قال فانا اللبنة و انا خاتم النّبیّین۔ (بخاری کتاب المناقب باب خاتم النبیین) فرمایا۔ میری اور پہلے انبیاء کی مثال ایک ایسے مکان کی سی ہے جسے ایک شخص نے بنایا اور اُسے خوب سجایا۔ مگر اس کے ایک کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھی۔ لوگ آتے اور اس مکان کو دیکھنے کے لئے اُس کا چکر کاٹتے۔ اور تعجب سے کہتے یہاں ایک اینٹ کی جگہ کیوں خالی ہے؟ میں وہ کونے کی اینٹ ہوں جس سے اس مکان کی تکمیل ہوئی اور خاتم النبیین ہوں۔

کونے کے پتھر کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں کہ وہ دو دیواروں کو آپس میں ملاتا ہے اور دیوار کے معنے قرآن میں رُوحانی سلسلہ کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیوار کی مثال بنی اسرائیل سے دی ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان دو دیواروں سے کیا مراد ہے جن کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کونہ کا پتھر بن کر ملایا۔ سو ایک دیوار تو پہلے انبیاء کی تھی۔ جو مختلف شریعتوں کے تابع تھے۔ اور ایک دیوار قرآن کی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں کے اتصال کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ آپؐ ہی کے ذریعہ آپؐ کی اُمّت پہلے انبیاء کو مانتی ہے۔ اور آپؐ ہی کے ذریعہ سے آئندہ آنے والے مامور پہلے نبیوں سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ دیکھ لو دوسری قوموں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کا تمام اقوام عالم سے تعلق قائم ہے۔

ہندوؤں کے سوا اور کسی قوم کا حضرت کرشن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے اُن سے بھی ہے۔ کیونکہ قرآن میں آیا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۵) اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ ہر قوم میں نبی آئے تو ہمیں کیا علم تھا کہ کرشن جی بھی خدا کی طرف سے تھے۔ پھر دیکھو یہود کو زرتشی قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک علیحدہ دیوار کھڑی ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کی ہر دیوار کو ملا دیا۔ زرتشت کی ساختہ دیوار سے اسلامی دیوار وابستہ ہے۔ اور دوسرے انبیاء کی دیواروں سے بھی اسلامی دیوار وابستہ ہے۔ پس کونے کے پتھر کے معنے یہ ہیں کہ آپؐ آئندہ آنے والے لوگوں اور پچھلی قوموں میں واسطہ پیدا کردیں گے پہلی دیواریں الگ الگ کھڑی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دیوار علیحدہ تھی حضرت عیسیٰؑ کی علیحدہ۔ حضرت کرشنؑ کی علیحدہ۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر دیوار میں کونے کا پتھر بن گئے اور آپؐ نے سب کو یہ کہہ کر ملا دیا کہ سب نبی خدا کی طرف سے ہیں۔ اور سب کا ایک ہی سلسلہ ہے۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ آپؐ کا مقابلہ سب دنیا سے ہوگا۔ آپؐ پر حملے کئے جائیں گے اور آپؐ بھی حملے کریں گے۔ مگر دونوں صورتوں میں وہ نبی ہی جیتے گا۔ اس میں یہ نہیں کہا کہ وہ جیتے گا۔ بلکہ یہ کہا۔ اگر یہ حملہ کرے گا تو بھی جیتے گا اور اگر دشمن تیار ہو کر حملہ کریں گے تو بھی یہی جیتیگا۔ چنانچہ جنگ احزاب۔ اُحد اور بدر میں دشمن چڑھ کر آگیا مگر ان میں بھی دشمن ہی کچلا گیا۔ اور فتح مکہ۔ خیبر اور تبوک کی جنگ میں آپؐ گئے۔ اور اُن میں بھی دشمن کچلا گیا۔

چھٹی بات یہ بتائی گئی تھی کہ آپؐ تسلی دینے والے ہونگے۔ اس کے متعلق یہ دیکھنا چاہیئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا کو تسلی کی ضرورت تھی یا نہیں۔ اگر ضرورت تھی تو کیا ان اقوام کو اُن کے مذاہب تسلی دے سکتے تھے؟ سو اس بارے میں

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذاہب اپنے ماننے والوں کے لئے تسلی کا باعث نہ رہے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو سب مذاہب اس سے خالی تھے اور قلبی اطمینان ان میں کسی کو حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کوئی قوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل گناہ کی معافی کی قائل نہ تھی۔ ہندو کہتے کہ پرمیشور کسی کا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ کی سزا دیتا ہے اور انسان کو مختلف جونوں میں جانا پڑتا ہے۔ اور سارے گناہوں کی سزا جونوں میں پڑ کر بھگت لینے کے بعد بھی پرمیشور ایک نہ ایک گناہ رکھ لیتا ہے اور پھر اس کی پاداش میں نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہندو اپنے مذہب کے ذریعہ تسلی نہ پا سکتے تھے۔ زرتشتی اور مسیحی ابدی دوزخ کے قائل تھے۔ اس عقیدہ کے ماتحت جس انسان سے ایک دفعہ بھی کوئی گناہ ہو جائے وہ یہی سمجھتا تھا کہ ابدی دوزخ میں جانا پڑے گا۔ اور اس وجہ سے وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ یہود بھی کسی کو تسلی نہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے نجات صرف یہود کے لئے ہے باقی سب کیلئے ہلاکت ہے۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کی امید کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ کوئی مذہب ابتداء میں ہی ناامیدی کے گڑھے میں گرا دیتا۔ کوئی درمیان میں لاکر منجھدھار میں چھوڑ دیتا۔ کوئی آخر میں ابدی دوزخ میں جھونک دیتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر سب کو تسلی دلائی (۱) جو گناہ کی معافی کے قائل نہ تھے۔ انہیں بتایا کہ تناسخ کے چکر کی ضرورت نہیں خدا تعالیٰ بڑا رحیم کریم ہے۔ وہ گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر: ۵۴) یعنی اے رسول! تو سب بندوں کو کہدے کہ مجھے خدا نے تسلی دینے والا بنایا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جنہوں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ انہیں خبر دے دے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ توبہ کرو تو وہ گناہ بخشدے گا۔

کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے،

(۲) پھر اُس نے اُن قوموں کی طرف مونہہ کیا جو کہتی ہیں کہ جو گنا ہگار مر گئے۔ اُن کے لئے ہمیشہ کا جہنّم ہے۔ اور سُنایا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے چنانچہ سورۃ اعراف: ۱۵۷ میں آتا ہے۔ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ پھر فرمایا۔ اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ [1] یعنی جہنّم ماں کی طرح ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ہمیشہ نہیں رہتا جب تک ناقص ہوتا ہے پیٹ میں رہتا ہے۔ اور جب کامل ہو جاتا ہے۔ پیٹ سے نکال دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ جہنم ماں کی طرح ہے۔ جب ان لوگوں کے گند دُور ہو جائیں گے جن کو اس میں ڈالا جائیگا اور اُن کی صفائی ہو جائیگی تو ہم اُن کو جنّت میں بُلا لیں گے۔ پس دوزخ صرف ایک تکمیل اور علاج کا مقام ہے۔ آخر سب خدا تعالیٰ کی بخشش کے نیچے آجائیں گے۔ اِس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان قوموں کو بھی تسلّی دی جو یہ سمجھتی تھیں کہ گنا ہگار ہونے کی حالت میں مرنے پر ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا پڑیگا

(۳) پھر وہ قومیں جو یہ کہتی تھیں کہ سوائے ہمارے اَور کسی کے لئے نجات نہیں اُن کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ لوگوں کو تسلّی دے دے کہ یہ غلط خیالات ہیں۔ جیسے یہود نے نادانی سے کہدیا کہ ہمارے سوا کوئی نجات نہیں پا سکتا۔ اور نسلاً یہ نجات ہمارے حصہ میں ہی آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ ہدایت کسی ایک قوم سے مخصوص ہے۔ نجات ہم نے دینی ہے اور ہمارا دروازہ سب کے لئے کھلا ہے چنانچہ فرمایا۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف ۱۵۹) یعنی تو لوگوں سے کہدے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ پس ہدایت کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ بلکہ ہر قوم اس میں برابر کی حقدار ہے۔

اب انسان کے دل میں ایک اور خوف پیدا ہوتا ہے کہ اچھا آپؐ آگئے۔ اور آپ کے ذریعہ سب کے لئے نجات کا دروازہ بھی کھل گیا۔ جس کیلئے ہم بڑے ممنون ہیں

[1] القارعۃ: ۱۰

گر ہمیں اپنے باپ دادا سے محبت ہے اُن کی کیا حالت ہوگی۔ مسیحیت کہتی ہے کہ وہ جہنم میں جائیں گے کیونکہ وہ کفارہ پر ایمان نہیں لائے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائیں گے کیونکہ سوائے یہود کے اور کسی کے لئے نجات نہیں۔ زرتشتی کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائیں گے ہندو بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا تعالیٰ کہتا ہے۔ کہدو وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ۔ (فاطر ۲) تم اپنے باپ دادوں کے متعلق مت ڈرو۔ اُن کے وقت بھی ہم نے نبی بھیجے تھے۔ اگر انہوں نے اُن انبیاء کو قبول کر لیا تھا تو خدا انہیں جنت میں لے جائیگا۔ یہ آباء کے متعلق اُن کو تسلّی دی۔

اب یہ وسوسہ باقی رہتا تھا کہ انسان گناہ سے تو بچ ہی نہیں سکتا۔ پھر نجات کیسے ہوگی۔ اس کے لئے فرمایا۔ یہ وسوسہ بھی دُور کردو۔ اور اِن سے کہو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۔[1] اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو تسلّی دے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ انسان کی فطرت گندی ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہم نے انسان کو نیک فطرت دے کر بھیجا ہے۔ جب انسان خطا کرتا ہے تب ہم اُسے نچلے درجہ میں بھیجتے ہیں۔ ورنہ بڑے بڑے انعام دیتے ہیں۔ گناہ ایک باہر سے آنے والی چیز ہے۔ اصل میں انسان کے اندر نیکی ہی رکھی گئی ہے۔

غرض اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو تسلّی دلائی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے لئے نجات کا دروازہ بند ہے۔ انہیں خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نیک نہیں ہو سکتے انہیں نیکی کی اُمید دلائی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ایک دفعہ گناہ کر لیا تو پھر اس کے وبال سے نجات نہیں اُن میں توبہ کا اعلان کیا۔ جو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ گنہگار مر گئے تو ہمیشہ کے لئے گئے۔ انہیں دوزخ کے ایک درمیانی سٹیج ہونے کا علم دیا غرض آپ ہی حقیقی معنوں میں دنیا کو تسلّی دلانیوالے تھے۔

[1] التین : ۵ تا ۷

یہ تو دوسروں کے متعلق فرمایا۔ اس کے بعد اپنے لوگوں کی باری آئی۔ اُن کی تسلّی کے لئے خدا تعالےٰ کا یہ ارشاد سُنایا۔ کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (سورۂ توبہ: ۱۰۳) فرمایا۔ جب وہ رسول دنیا کو تسلّی دے گا تو اس کی اُمت والے کہیں گے کہ یہ تو ہم پہلے ہی دن حاصل کر چکے ہیں۔ پھر ہمیں کیا ملے گا۔ فرمایا۔ اُن سے مساکین کے لئے چندے لو۔ اور اِس طرح ان کو پاک کرو۔ اور اُن کی ترقیٔ مدارج کے لئے دُعائیں کرو۔ کہ جس کے لئے تو دُعا کرتا ہے اُس کے لئے تسلّی ہی تسلّی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ تیری دُعا سُنے کیونکہ وہ سمیع ہے۔ اور اگر بعد میں آنے والی امت کہے کہ ہمارے لئے کیا ہے۔ تُو ان سے کہو خدا علیم ہے۔ اب بھی تمہارے لئے وہ دُعا موجود ہے اور تم اس سے حصّہ لے سکتے ہو۔ اِس طرح اُن کے لئے بھی تسلّی کا سلسلہ جاری کر دیا۔

ساتویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ رسول دنیا کو تین طرح مجرم قرار دے گا (۱) گناہ سے (۲) راستبازی سے (۳) عدالت سے۔ یعنی ایک قوم سے کہیگا کہ یہ مسیح کا انکار کرنے والے ہیں۔ اس لئے مجرم ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ [1] یعنی بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی تھی۔ اِسی طرح غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں حضرت مسیح کا انکار کرنے والوں کو مغضوب قرار دے کر اُن سے پناہ مانگی گئی ہے (۲) راستبازی سے اس طرح مجرم قرار دیا کہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد نصاریٰ نے انہیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ تم نے راستبازی تو اختیار کی یعنی مسیح کو قبول کیا لیکن پھر صحیح راستہ کو چھوڑ کر کہیں کے کہیں نکل گئے۔ اس لئے تمہارا نام ضالّ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے ظاہر ہے۔ (۳) باقی قوموں کو آپؐ نے عدالت سے مجرم قرار دیا یعنی

[1] المائدۃ: ۷۹

اِس وجہ سے کہ وہ شرک کی مرتکب ہوئیں اور توحید کو جو عدل کا طریق تھا انہوں نے ترک کر دیا اِسی وجہ سے قرآن کریم میں شرک کا نام غیر عدل رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (انعام:۹۲) ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اس طرح اندازہ نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیئے تھا۔ اِسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (انعام:۸۳) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ایمان کو ظلم سے نہیں ملایا۔ انہی لوگوں کیلئے امن مقدر ہے۔ اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔ احادیث میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہر شخص تھوڑا بہت ظلم تو کر بیٹھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اسجگہ ظلم سے مراد شرک ہے۔

غرض اس پیشگوئی کے مطابق ہر قوم جو اہل کتاب میں سے ہے آپؐ نے اُسے مثیل یہود قرار دے کر مغضوب یا مثیلِ نصاریٰ قرار دے کر ضالّ قرار دیا۔ اور جو قومیں اہل کتاب نہ تھیں۔ اُن کے متعلق عدالت کو اس رنگ میں استعمال کیا کہ فرمایا ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ اور شرک کا ارتکاب کر کے صحیح راستہ سے منحرف ہوگئی ہیں۔ گویا۔ گناہ کا لفظ جو انجیل میں استعمال ہوا ہے وہ تفریط کے مترادف ہے۔ راستی افراط کے مترادف اور عدالت توحید سے بے اعتنائی کے مترادف ہے۔ اور تین ہی گروہ قرآن کریم نے قرار دیئے ہیں۔

آٹھویں بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ایسی باتیں کہیگا۔ جو اس سے پہلے نہیں کہی گئیں۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ (انعام:۹۲) تمہیں وہ وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو نہ تمہیں معلوم تھیں اور نہ تمہارے باپ دادا کو۔ اِن باپ دادا میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل ہیں۔

نویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ سب سچائیاں بتائے گا جن کے بعد کسی اور سچائی

کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ بھی قرآن کریم میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ: ۴) آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

دسویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا بلکہ جو کچھ سُنیگا وہی کہیگا۔ یعنی اس کا کلام کلّی طور پر الہام پر مشتمل ہوگا۔ یہ پیشگوئی صرف قرآن کریم پر ہی چسپاں ہوتی ہے۔ ورنہ انجیل اور تورات میں تو حواریوں کا کلام بھی درج ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے:۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی [1] یعنی وہ اپنی ہوا و ہوس سے نہیں بولتا۔ بلکہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی ہے۔ پھر آتا ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ (توبہ: ۶) مشرکین میں سے اگر کوئی کہے کہ مجھے پناہ دو۔ میں خدا کی باتیں سُننا چاہتا ہوں تو تم اُسے بلاؤ تاکہ وہ کلام اللہ سُن لے۔

گیارھویں بات یہ بتائی تھی کہ وہ میرا جلال یعنی بزرگی ظاہر کرے گا۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ سورۂ بقرہ میں آتا ہے۔ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ: ۸۸) یعنی ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے نشانات دیئے اور رُوح القدس کے ذریعہ اس کی تائید کی۔ پھر آتا ہے۔ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا [2] کہ ان لوگوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور نہ صلیب پر چڑھا کر مارا۔ ہاں صلیب پر چڑھایا ضرور تھا۔ اور وہ اُن کے لئے مصلوب کے مشابہ بنا دیا گیا تھا۔ وہ لوگ جو اس بات میں اختلاف کر رہے ہیں وہ یقیناً شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس بات کے متعلق کوئی یقینی علم نہیں وہ صرف ایک وہم کی

[1] النجم: ۴، ۵ [2] النساء: ۱۵۸، ۱۵۹

پیروی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہرگز حضرت عیسیٰؑ کو نہیں مارا۔ بلکہ اللہ نے اُن کو اپنے حضور میں بڑی عزت اور رفعت بخشی تھی (گویا آپؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی نہ ہی بزرگی ظاہر کی جس کا پیشگوئی میں ذکر ہے) اور کیوں خدا ایسا نہ کرتا۔ وہ عزیز اور حکیم ہے۔ یعنی ضروری تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے منکرین صلیب پر لٹکاتے مگر یہ بھی ضروری تھا کہ وہ صلیب پر فوت نہ ہوتے اس لئے کہ اللہ عزیز اور حکیم ہے۔ چونکہ وہ عزیز یعنی غالب ہے اس لئے ضروری تھا کہ یہود کو بتاتا۔ کہ میں غالب ہوں۔ تم عیسیٰؑ کو جسے میں نے بھیجا ہے مار نہیں سکتے۔ اور وہ حکیم ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ یہود حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکاتے تاکہ بعد میں جب عیسائی کہتے کہ مسیح خدا ہے تو مسلمان کہتے اچھا خدا ہے جسے یہود نے صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ پس فرمایا ہم غالب ہیں۔ ہمارا فرض تھا کہ عیسیٰؑ کو صلیب پر مرنے سے بچاتے۔ اور ہم حکیم ہیں اس لئے ضروری تھا کہ صلیب پر چڑھاتے۔

بارھویں بات یہ بتائی کہ وہ مسیح کے راستباز ہونے کا عملی ثبوت دکھائیگا۔ یعنی مشاہدہ کرا دیگا۔ جو فوت ہو گیا اُسے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دکھا نہیں سکتے تھے۔ اُسے اسی طرح دکھایا کہ فرمایا۔ میری اُمت میں سے ایک سپہ سالار کھڑا ہو گا جس کا نام مسیح ہو گا۔ اور اس طرح عملاً مسیح کی راستبازی کو ثابت کر دیگا۔ کیونکہ اتنے بڑے آدمی کو اس سے مشابہت دینا یہی معنے رکھتا ہے کہ مسیح بھی بزرگ اور برگزیدہ ہستی تھی چنانچہ حضرت مرزا صاحبؑ جو مسیح موعود ہیں انہوں نے مسیح کی تصویر کھینچ کر دکھا دی۔

قانونِ شریعت اور قانونِ طبعی کی باہم مطابقت کا حیرت انگیز سلسلہ

اب دیکھو یہ نشان کتنا عظیم الشان ہے۔ کتنا لمبا سلسلہ چلتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام تک جو دو ہزار سال کا زمانہ ہے تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ پھر حضرت مسیحؑ کے سلسلہ کے چھ سو سال کے عرصہ میں بھی تغیرات

ہوتے ہیں۔ اور آخر وہ انسان ظاہر ہوتا ہے جو اِن کا مصداق تھا۔ اگر صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعویٰ کرتے اور شریعت لے آتے تو لوگ کہتے یہ کلام آپؐ نے خود بنا لیا ہے مگر یہاں تو قانونِ شریعت اور قانونِ طبعی صدیوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر چل رہے ہیں اور ثابت ہو رہا ہے کہ ہمارا خدا آسمانوں کا ہی بادشاہ نہیں بلکہ زمین کا بھی بادشاہ ہے۔ قانونِ شریعت کہتا ہے کہ مکّہ میں ایک نبی آئیگا اور قانونِ طبعی اس کے لئے سامان مہیا کرتا ہے۔ تباہی اور ہلاکت کی آندھیاں چلتی ہیں۔ قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ وبائیں آتی ہیں اور قوموں کو ہلاک کر کے چلی جاتی ہیں۔ زمانہ کی گردشیں آتی ہیں اور قوموں کا نام و نشان مٹا دیتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر قریش ان تمام آفات سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ اُن کی تائید ہوتی ہے۔ ابرہہ مکّہ پر چڑھائی کرتا ہے اور کہتا ہے مکّہ اور اہلِ مکّہ کو میں تباہ و برباد کر دونگا۔ مگر خود اس کا لشکر تباہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ ناکام و نامراد لوٹ جاتا اور راستہ میں ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قانونِ طبعی کہتا ہے کہ میں اس قوم کو نہیں مٹنے دونگا قوموں میں تغیّرات آتے ہیں۔ مرد نامرد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح خاندانوں کے نام و نشان مٹ جاتے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں یہ تغیّر نہیں آتا۔ اسلئے کہ آپ کی نسل بڑھے اور ترقی کرے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ قیصر و کسریٰ کی تباہی کی خبر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ان میں تباہی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ مگر اُن کی تباہی کی خبر تو یسعیاہ اور حبقوق نے بھی دی تھی اور کئی ہزار سال پہلے دی تھی جبکہ قیصر و کسریٰ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور پھر قانونِ قدرت نے اُن کی تباہی کے سامان اُس وقت پیدا کئے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو گئے۔

اِسی طرح جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر ہوئے تو ہو سکتا تھا کہ مکّہ سے نکالے نہ جاتے۔ اگر نکالے گئے تھے تو آپ کی قوم آپ پر حملہ نہ کرتی۔ اگر حملہ کرتی تو شکست نہ کھاتی۔ مگر یہ سب کچھ ہوا۔ اب غور کرو یہ کس نے کرایا؟

اِسی طرح ممکن تھا کہ ابوجہل حملہ نہ کرتا اگر اُس نے کیا تو عبداللہ کو غصہ نہ دلاتا تاکہ وہ اس کی گردن چھوٹی دھ کاٹے۔ مگر اس کے لئے اسباب پیدا ہوئے۔ یہ اسباب کس نے پیدا کئے۔ اِن سے صاف نظر آتا ہے کہ دو ہزار سال سے زمین و آسمان کی بادشاہت ایک ساتھ چل رہی تھی۔ آسمان سے یہ حکم ہو گیا کہ ابراہیمؑ کی نسل کو قائم رکھنا۔ تباہی و بربادی کی آندھیاں آئیں تو انہیں کہہ دیا جاتا کہ دیکھنا مکّہ پر کوئی آنچ نہ آئے۔

اِسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ اتنا عرصہ قبل بتا دینا اور پھر اُس کا ہو بہو پورا ہونا۔ یہ سب باتیں قانون طبعی کے ماتحت تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کے نتیجہ میں فرماتا ہے۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اے خدا کے منکرو غور تو کرو کیا یہ قانون آپ ہی آپ چل رہا ہے۔ مَیں دو ہزار سال کی ہسٹری پیش کر کے بتاتا ہوں کہ خدا ہے اور یقیناً ہے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] سے خدا کا ثبوت ملتا ہے اور حضرت مسیحؑ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے متعلق فرمایا کہ اُس وقت خدا خود آجائیگا۔ یعنی آپؐ کے وجود سے خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت ملیگا۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اپنے پیروؤں سے یہ بھی کہا۔ کہ دُعائیں مانگو کہ اے خدا جیسی تیری آسمان پر بادشاہت ہے ویسی ہی زمین پر بھی آئے۔ یعنی تم ہمیشہ دُعائیں مانگتے رہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوں۔ دُعائیں مانگتے رہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ آسمان اور زمین کا خدا ایک ہی ہے۔

اِس میں نہ صرف دہریوں کا ردّ ہے بلکہ جینیوں اور آریوں کا بھی ردّ ہے۔ جینی کہتے ہیں کہ رُوحیں ترقی کرتے کرتے آپ ہی اونچی ہو جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یہ غلط ہے ہم خود تغیّرات کرتے کرتے کامل رُوح پیدا کرتے ہیں۔ آریہ کہتے ہیں۔ دنیا میں خدا کا تصرف نہیں۔ مادہ اور رُوح آپ ہی آپ سب کچھ کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے دنیا کا سارا انتظام ہمارے احکام کے ماتحت چلتا ہے اور ہر قسم کے تغیّرات ہم خود پیدا کرتے ہیں۔

[1] آل عمران: ۱۹۰

طبعی قانون پر خدائے واحد کی حکومت

ذرا غور کرو۔ قانونِ شریعت کا قانونِ قدرت نے ایک زمانۂ دراز تک کس طرح ساتھ دیا۔ اور کس طرح اس کے ماتحت چلا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریباً پونے تین ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ کیا یہ طبعی قانون پر حکومت نہیں کہ اسوقت تک حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جاری رہے گی۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا نام ایسا روشن ہوگا کہ اُن کی اولاد اس بات کو یاد رکھے گی کہ وہ ان کی اولاد ہے۔ مکّہ قائم رہیگا۔ اُس میں ایک خاص شخص ایک خاص حلیہ کا پیدا ہوگا۔ اس کی قوم اس کا مقابلہ کرے گی اور اُسے گھر سے نکال دیگی۔ وہ نبی حضرت موسیٰؑ کی طرح صاحب شریعت ہوگا۔ وہ پہلے کمزور ہوگا اور گھر سے نکالا جائیگا۔ لیکن خدا تعالیٰ اُسے جماعت دیگا۔ وہ مصائب برداشت کریگا۔ اور صبر کریگا۔ لیکن اس کی قوم کا اس پر ظلم بڑھتا جائیگا۔ آخر دشمن خفیہ تدبیر کرے گا کہ اس کے کمزور ساتھیوں کو تباہ کردے اور فخر کرتا ہوا آئیگا۔ یہ واقعہ اس کی ہجرت کے ایک سال بعد ہوگا۔ جب مقابلہ ہوگا تو میدان اس کے ہاتھ رہیگا۔ اور دشمن کے اکثر سردار مارے جائیں گے۔ اُن میں سے رئیس المکفرین عالی خاندان والا اُسکے ساتھیوں کے ہاتھوں اِس طرح مارا جائیگا کہ اُسی دشمن کے ہتھیار سے ایک شخص اس کی گردن تک سر کو ننگا کرکے اُس کا سر کاٹ دے گا۔ اُس کا قد اونچا لیکن بدنما اونچا نہ ہوگا۔ وہ چلتے وقت زور سے قدم ماریگا (زمین اُس کے قدموں سے لرزیگی) اس کا رنگ سفید لیکن سُرخی مائل ہوگا۔ اُس کے بال گھنگھرالے ہونگے۔ لیکن بالکل گھنگھرالے نہیں۔ اُن میں پیچ پڑے ہونگے۔ اُس کا کلام شیریں ہوگا لیکن سچائی پر مشتمل ہونے کے سبب سے لوگوں کو تلخ معلوم ہوگا۔ اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔ آخر وہ ایک دن فاراں کی پہاڑیوں سے ہوتا ہوا مکہ پر حملہ آور ہوگا۔ دس ہزار سپاہی جو نہایت نیک و پاک ہونگے اس کے ساتھ ہونگے۔ اور وہ مکّہ کو فتح کرے گا۔ اسکے بعد ملک اس پر ایمان لے آئیگا۔

اُس کے کام ایسے شاندار ہونگے کہ لوگ انہیں دیکھ کر عجیب کہہ اُٹھیں گے۔ وہ نہایت بااخلاق ہوگا اور غریب و مسکین اُس سے مشورہ کرنے میں نہ جھجکیں گے۔ اُس کے کلام میں اُسے مثیل موسیٰ کہا جائے گا۔ اُس کی قوم کے کاموں سے خدا تعالیٰ خوش ہوگا۔ وہ انہیں مقدس بنائیگا۔ اور ہمیشہ انہیں مقدس بنانے کے سامان پیدا کرتا رہیگا۔ اُس کے مذہب کا نام نیا ہوگا اور خدا تعالیٰ خود وہ نام انہیں دیگا اور اُس میں سلامتی کا لفظ پایا جائیگا (سلامتی کا شہزادہ یعنی سردار اسلام اس کا لفظی ترجمہ ہے) اس کے شہر کو ہمیشہ آباد رکھا جائیگا۔ اور لوگ دُور دُور سے اس کا قصد کر کے آئیں گے۔

وہ جس طرف رُخ کریگا لوگ مرعوب ہونگے۔ قومیں اس پر مل کر حملہ کرینگی لیکن شکست کھائیں گی (سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ القمر:۴۶) اور اس کے دشمن ہلاک ہونگے۔ اُس کا مقابلہ ایک طرف شامی حکومت سے اور ایک طرف ایرانی حکومت سے یعنی قیصر و کسریٰ سے ہوگا۔ اور دونوں شکست کھائیں گی۔

اُس کے آنے کے بعد پہلی سلطنتیں اور پہلے دینوں کی برکت مٹ جائے گی اور ترقی رُک جائیگی۔ (عیسائیت نے بظاہر ترقی کی ہے لیکن پہلے عیسائیت نے بذریعہ تلوار بڑھنا چاہا اور بذریعہ تلوار روکی گئی۔ اب بذریعہ تبلیغ بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے تو حضرت مسیح موعودؑ مقابلہ کیلئے پیدا ہوگئے) اُس کی قوم میں ہمیشہ مصلح پیدا ہوتے رہیں گے۔ وہ اگلے اور پچھلے لوگوں میں بمنزلہ ایک واسطہ کے ہوگا۔ اُس کی تعلیم سلامتی کی تعلیم ہوگی۔ وہ کسی خاص قوم کے لئے نہ ہوگی بلکہ سب کے لئے ہوگی۔ اُس کا رویہ دوسروں کے لئے ایک نمونہ کے طور پر ہوگا۔ اور دوسری اقوام اس کے اثر سے اپنے اندر ایک پاک تبدیلی پیدا کرلینگی۔ اُس کی تعلیم کے ذریعہ سے بے حکمت اور رسمی احکام کو مٹا کر باحکمت تعلیم دی جائیگی۔ اُس کی تعلیم میں ہر قسم کے ضروری امور بیان ہونگے اور وہ بالکل مکمل ہوگی جس کے بعد کسی اَور تعلیم کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کی تعلیم کا ماحصل یہ ہوگا کہ وہ نجات کا راستہ ہر قوم اور ہر حالت کے لوگوں کے لئے کھولیگا۔ اور افراط و تفریط

اور شیطانی غلامی سے لوگوں کو بچائیگا۔ (غیر الہامی مذہب کلی طور پر شیطان کے قبضہ میں ہیں) وہ فطرتِ انسانی کی نیکیوں کو اُبھارے گا۔ اُس کی کتاب خالص الہام پر مشتمل ہوگی ایک لفظ بھی دوسرا اُس میں موجود نہ ہوگا۔ وہ گذشتہ انبیاء پر سے الزامات کو دُور کرے گا خصوصاً حضرت مسیح کی پاکیزگی ایک خاص نمونہ کے ذریعہ لوگوں کو عملاً دکھا دیگا۔

یہ اخبار ایسی ہیں کہ جو ایک وقت میں نہیں دی گئیں۔ ایک وقت میں ان کے سامان نہیں پیدا کئے گئے۔ قوموں اور شہروں کا زندہ رہنا ہزاروں سال کے طبعی تصرّفات کا نتیجہ ہے۔ ایک خاص جلیہ کے شخص کا پیدا ہونا خاص علم الحیوانات کا نتیجہ ہے۔ دشمنوں اور دوستوں کے دل میں ان خیالات کا پیدا ہونا جو مذکور تھے خاص علم النفس کے ماتحت تغیرات کا نتیجہ ہے۔ دشمنوں کا زیر ہونا خاص سیاسی تغیّرات کا نتیجہ ہے۔ (مسیحی کہتے ہیں کہ قیصر و کسریٰ پہلے سے کمزور تھے۔ ہم کہتے ہیں اِس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کی مدد کے لئے پیدائش سے بھی پہلے سے سامان ہو رہے تھے) اِسی طرح خاص تعلیم اور اس کی تفصیلات خاص آسمانی توجہات کا نتیجہ ہیں۔ غرض صاف طور پر یہ سلسلہ آسمانی اور زمینی بادشاہت کے ایک ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اِن سب امور کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لِلّٰہِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمانی اور زمینی بادشاہتوں کا اتحاد ایک بالا اور بالارادہ ہستی کا ثبوت دے رہا ہے فسبحان اللہ الملک القدوس۔ یہ مَیں نے ہی نہیں کہا۔ بلکہ حضرت مسیحؑ ناصری بھی اس دلیل میں میرے ساتھ متفق ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کی یہ دُعا کہ تیری بادشاہت آئے۔ تیری مراد جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی آئے (لوقا ۱۱/۲) اِس سے حضرت مسیح کا یہی مطلب ہے کہ ظہور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دُعا کرو کہ اِسی کے ذریعہ سے آسمانی بادشاہت کا ظہور زمین پر ہوگا۔

اب دیکھو یسعیاہ باب ۹ اور حضرت مسیح کی پیشگوئی (متی باب ۲۱) کس رنگ میں پوری ہوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ خدائے قادر ہوگا اور مالک ارض و سما ہوگا۔ (یعنی باغ کا مالک) اِس کے یہی معنے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا زبردست ثبوت اور آسمانی

اور زمینی نظاموں کا ایک بالارادہ ہستی کے ہاتھ میں ہونے کا ثبوت آپ کی ذات میں ملے گا۔ اور اُن کے ذریعہ سے لوگ قطعی طور پر خدا تعالیٰ کی ہستی کا علم حاصل کریں گے۔ پس آپؐ کا آنا خدا کا آنا ہوگا۔

قرآن کریم کی دوسری اصولی اصلاح

قرآن کریم نے جو دوسری اصلاح کی وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق ہے۔

چنانچہ دوسری اصولی غلطی جو دنیا میں پیدا ہوئی وہ خدا تعالیٰ کے ماننے والوں میں سے بھی اُس گروہ میں پیدا ہوئی جو خدا تعالیٰ کو تو مانتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی زندگی کا منکر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا دنیا کو پیدا کر کے اب الگ ہو گیا ہے۔ اور اب سب تغیرات آپ ہی آپ ہو رہے ہیں۔ گویا نعوذ باللہ اگر خدا تعالیٰ نہ بھی رہے تو بھی دنیا چلتی رہے گی۔ اور دنیا کے انتظام میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو دُعا کے منکر اور ہر امر کو قانونِ قدرت کے تابع قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ہر زمانہ میں ہوتے آئے ہیں۔ اِس زمانہ میں علی گڑھ میں سید احمد ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ اور اس سے پہلے بھی بہت سے لوگ ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں۔ جو یہ کہتے تھے کہ خدا اب دنیا کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ اسلام نے اِن لوگوں کی غلطی کو بھی دُور کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران: ۲۷، ۲۸) فرمایا۔ کہو اے اللہ! تو ہی ہے جو ملک کا مالک ہے۔ تُو جسے چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ تو جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے۔ ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ تو دن کو رات میں اور رات کو دن میں داخل کرتا ہے۔ تو زندہ کو مُردہ سے

اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بنا دیا اب وہ بالکل بے دخل ہے کس طرح پیدا ہوا۔ اصل میں تو یہ قلّتِ معرفت سے پیدا ہوا ہے۔ مگر نسفی اس کے متعلق کچھ دلائل بھی دیتے ہیں۔ جو یہ ہیں:-

اوّل اگر خدا کا تصرّف قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ تو یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت کی غرض باطل ہو جاتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قانون بنایا ہے کہ آگ جلائے۔ اگر کوئی خدا سے دُعا کرے کہ آگ نہ جلائے اور یہ دُعا قبول ہو جائے تو دُنیا میں ابتری پھیل جائیگی۔ اور کوئی ترقی نہ ہو سکیگی۔ قانونِ قدرت کی اتباع اسی لئے کی جاتی ہے کہ اس کا ایک یقینی نتیجہ نکلتا ہے۔ لوگ آگ جلاتے ہیں اس لئے کہ وہ جلتی ہے۔ پانی پیتے ہیں اس لئے کہ پیاس بجھاتا ہے۔ اگر کبھی پانی پینے سے شعلے نکلنے لگ جائیں تو کوئی نہ پیئے۔

دوم قانون کے خلاف تصرّف کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک نے سامانِ جنگ تیار کیا۔ اور لشکر جمع کیا۔ اور اس طرح جنگ میں فتح پانے کے متعلق قانونِ قدرت کی اطاعت کی۔ لیکن ایک دوسرے نے دُعا کر کے اُسے شکست دے دی۔ تو یہ انصاف کے خلاف ہے کہ جو قانون کے مطابق کام کر رہا ہے وہ تو نقصان اُٹھائے اور جو مخالف ہے وہ جیت جائے۔

تیسرے اگر تصرف قانونِ قدرت کے مطابق ہے تو پھر بے فائدہ ہے۔ کسی کی دُعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں دُعا کے قبول ہونے کا دعویٰ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نے روٹی کھائی۔ مگر میں نے دُعا کی تھی جو قبول ہو گئی اور میرا پیٹ بھر گیا۔ یہاں دُعا نے کیا اثر کیا یہ تو روٹی نے اپنا اثر دکھایا۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں۔ ہر چیز کا سبب موجود ہے بلکہ جسے دُعا کا نتیجہ کہتے ہیں اس کا بھی ہم سبب بتا دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں۔ دُعا کی اور لڑکا پیدا ہو گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ میاں بیوی ملے تب بچہ پیدا ہوا اور اسی طرح بچے

پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی ایسی چیز دکھاؤ جو اسباب سے الگ ہو۔ اگر پیشگوئیاں پیش کرو۔ مثلاً کہو بتایا گیا تھا کہ بیٹا ہوگا اور ہوگیا۔ تو پیشگوئی اظہار واقعہ ہے۔ بیٹا پیدا ہونا تھا۔ تمہیں اس کا پتہ لگ گیا۔ اور تمہیں بتا دیا گیا۔ اِس سے دُعا کا کیا تعلق ہُوا؟

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اِس سے قانونِ قدرت کی غرض باطل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی بالعموم سامان ہی پیدا کرتا ہے جن سے انسان کو اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ وہ بغیر اسباب کے تصرّف نہیں کرتا بلکہ اپنی مشیت پوری کرنے کے لئے بعض نئے اسباب پیدا کر دیتا ہے جو لوگوں کی نگاہ سے مخفی ہوتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہر سبب یقینی نہیں مگر پھر بھی لوگ اُن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جیسے بیماریوں میں علاج کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں لیکن کیا کوئی علاج یقینی اور قطعی ہے۔ آخر سب بیمار تو اچھے نہیں ہوتے۔ مگر پھر بھی لوگ علاج پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ ہر جگہ استثناء پایا جاتا ہے۔ اور استثناء قاعدہ کو کمزور نہیں بلکہ اُسے مضبوط کرتا ہے۔ اِسی طرح اگر اللہ تعالیٰ بھی کبھی تقدیرِ خاص جاری کرے تو اِس سے قانونِ قدرت میں کوئی خرابی واقعہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک زائد فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کا جلال نظر آجاتا ہے اور اُن کا ایمان اپنے رب پر بڑھ جاتا ہے۔ (۲) تصرّف انصاف کے بھی خلاف نہیں کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ قانونِ قدرت جدھر چل رہا ہو انصاف بھی اُسی طرف ہو۔ مثلاً ایک ڈاکو جاتا ہے اور ایک بچے کی گردن پر تلوار مار کر اُسے اُڑا دیتا ہے۔ اب قانونِ قدرت کہتا ہے کہ جب تلوار گردن پر پڑے تو سر الگ ہو جائے مگر کیا یہی انصاف ہوگا۔ دنیا میں کروڑہا مواقع ایسے پیش آتے ہیں جبکہ قانونِ قدرت کو لوگ غلط رنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ ایسے نشان دکھائے جن سے قانونِ قدرت کا غلط استعمال رُک جائے۔ چنانچہ جب ایسے مواقع پر خدا تعالیٰ قانونِ قدرت کے غلط استعمال کو اپنے تصرّف سے

روکتا ہے تو بحیثیت مجسٹریٹ نہیں۔ بلکہ بحیثیت مالک روکتا ہے۔ اور دُعا اُسی وقت قبول ہوتی ہے جب دُعا کرنے والا حق پر ہوتا ہے۔ ورنہ دُعا اُس کے مونہہ پر ماری جاتی ہے۔ پس اِس ذریعہ سے خدا تعالےٰ نے قانونِ قدرت کے صرف ناجائز استعمال کو رَدّ کیا ہے اور یہ ظلم نہیں بلکہ انصاف کے عین مطابق ہے۔ (۳) یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر خدا کا تصرف قانونِ قدرت کے مطابق ہے تو پھر تصرّف کیسا ہوا یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ اگر تصرّف محض قانون کے مطابق چلے تو بے شک بے فائدہ کہلائیگا۔ لیکن اگر تصرّف قانون کو اپنے مطابق کرنے کے ذریعہ سے ظاہر ہو تو پھر وہ بے فائدہ کیوں ہُوا۔ ایسی صورت میں تو اگر تصرف نہ ہوتا تو قانون مخالف رنگ میں ظاہر ہوتا اور نقصان کا موجب بنتا۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہر چیز کا سبب موجود ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کے تصرف کے مدعی یہ تو کہتے ہی نہیں کہ وہ بغیر اسباب کے تصرف کیا کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دُعا کرنے والے کی تائید میں اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اور اسباب پیدا کرنا دنیا کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔ ورنہ بغیر ظاہری اسباب کے تصرف تو بعض دفعہ فساد کا موجب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں بھی خدا تعالےٰ نے اسباب کو مخفی کیا۔ وہاں عوام کو ٹھوکر لگی۔ جیسے دیکھ لو مسیح کی پیدائش یہود کے لئے ٹھوکر کا موجب ہوئی۔ اور انہوں نے حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا۔ لیکن یحییٰ کی پیدائش اُن کے لئے کسی ٹھوکر کا موجب نہ تھی۔ اِسی طرح سارہ کے ہاں بچہ پیدا ہونا بھی لوگوں کے لئے کسی ٹھوکر کا موجب نہ بنا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت اسحاقؑ اور یحییٰؑ کی پیدائش میں ظاہری اسباب موجود تھے۔ مگر حضرت مسیحؑ کی پیدائش میں وہ اسباب نہیں تھے۔ اِس لئے ان کو ٹھوکر لگی۔ حالانکہ مریم میں بچہ کے پیدا کرنے کی خاصیت پیدا کرنا یا زکریاہ اور سارہ میں پیدا کرنا بالکل ایک ہی بات تھی پس اسباب کا مخفی کرنا بسا اوقات فضل کی بجائے فتنہ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اسباب کا پیدا کرنا انسان کے لئے رحم کے طور پر ہے اور لوگوں کو فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔ ہم اس بات کے ہرگز

قائل نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر اسباب کے کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یا جہاں اسباب ہوں وہاں اللہ تعالیٰ کا تصرف نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ دُعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ جن سے کام ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ اسباب کسی کو نظر نہیں آتے۔ لیکن دُعا کے نتیجہ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تجارت میں ترقی دینے کے اللہ تعالیٰ نے کئی اسباب بنائے ہوئے ہیں مگر ہر شخص کو پورے سامان میسّر نہیں آتے۔ جب دُعا کی جائے تو وہ اسباب مہیّا ہو جاتے ہیں اور ایسا انسان ترقی کر جاتا ہے۔ لیکن اگر خدا تعالیٰ یُوں ہی کسی کے گھر دس ہزار روپیہ پھینک دے تو فوراً پولیس آکر اُس کو پکڑے کہ کہیں سے چوری کر کے لایا ہے۔ پس اسباب کا پیدا کرنا بسا اوقات خود اُس شخص کے لئے مفید ہوتا ہے جس کے لئے وہ تصرّف کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مان لیا خدا اسباب پیدا کرتا ہے۔ مگر ایک منکر کو کس طرح منواؤ گے کہ خدا نے اسباب پیدا کئے اور اس طرح اس کا تصرّف ظاہر ہوا۔ یا فلاں موقعہ پر عام قانون جاری ہوا۔ اور فلاں موقعہ پر تصرف۔ اِس کے دو جواب ہیں۔ اوّل یہ کہ جو خدا کا ہو جاتا ہے اس کا ہر فعل ہی تھوڑے یا بہت تصرّف میں ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات اپنے خاص تصرّف کے ماتحت اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ جن میں بندہ پر کوئی اعتراض نہیں آتا۔ اور اُس کی طاقت کا ایک نشان ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے بدر کے موقع پر ہوا۔ خدا تعالیٰ نے آندھی چلا دی اور ساتھ ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنکر چلائے۔ کفار آندھی کی وجہ سے دیکھ نہ سکتے تھے کیونکہ آندھی کا رُخ اُن کی طرف تھا۔ اور مسلمان خوب زور سے اُن پر حملہ کرتے تھے اِس قسم کی مثالوں کے متعلق دشمن کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ خاص تصرّف ہوا اور جس کی تائید میں ایسا نشان ظاہر ہو اُس پر کوئی الزام بھی نہیں آتا۔ لیکن ایسی مثالیں کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہیں اور لمبے زمانہ تک دلیل رہتی ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ نیا انسان بھیج دیتا ہے اور اس کی تائید میں ایسے نشانات دکھائے جاتے ہیں۔

اَب رہا یہ اعتراض کہ کیوں نہ سمجھیں کہ پیشگوئیاں صرف اظہارِ حقیقت ہوتی ہیں اُن میں

خدا کا کوئی تصرف نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اظہارِ حقیقت بھی تو کسی غرض کے لئے ہوتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کسی سے کہتا ہے کہ تمہارے ہاں بیٹا ہوگا تو یہ کیوں قبل از وقت بتاتا ہے۔ اس کی کوئی غرض ہونی چاہیئے۔ یا کسی کو بتاتا ہے کہ تم مرجاؤ گے تو اس کے بتانے کی بھی کوئی حکمت ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ خوشخبری اس لئے دیتا ہے تا انسان اس کے لئے کوشش کرے۔ اور ڈراتا اس لئے ہے تاکہ آنے والی مصیبت سے انسان بچ سکے ورنہ اگر کوئی پیشگوئی بے مقصد ہو تو وہ فضول ہے۔ اگر خیر کے حصول اور شر سے بچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تو پھر بتانے کے معنے ہی کیا ہوئے۔ اور اگر کہو کہ قبل از وقت بتانے کی غرض ہوشیار کرنا ہے تو یہ بھی تو تصرف ہے۔ کسی کو بتا دینا کہ ایسے اسباب پیدا ہو رہے ہیں تم اُن کے مقابل میں ایسے ایسے اسباب پیدا کر لو۔ یہ بھی تو تصرف ہی ہے خواہ بالواسطہ ہی سہی۔ یہ تو فلسفیوں کا اعتراض تھا جس کا جواب دیا گیا۔ دوسرا اعتراض عملی لوگوں کا ہے، وہ کہتے ہیں۔ ہم دُعا کرتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتی۔ ہم نے دعا مانگی کہ بیٹا ہو مگر نہ ہوا۔ ہم نے مقدمہ جیتنے کی دُعا مانگی مگر نہ جیتے۔ قرآن نے ان سب باتوں کا جواب دیا ہے اور اپنے دعویٰ کے دو ثبوت دیئے ہیں ایک فلسفیانہ اور ایک مشاہدہ کا۔ فرماتا ہے :—

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا

مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ قف ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ (سورۃ آل عمران: ۱۹۶ تا ۱۹۸)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تصرّف کے کئی دلائل دیئے ہیں (۱) پہلی دلیل یہ دی ہے کہ اس دنیا کی پیدائش میں طبعی قانون کا ہی اجراء نہیں بلکہ رُوحانی اور اخلاقی قانون بھی عمل کر رہا ہے۔ تم تو کہتے ہو کہ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ دخل دے مگر ہم ایک اَور نکتہ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ دیکھو اس دنیا کو کیوں پیدا کیا گیا؟ کیا اس لئے کہ انسان کھائے پیئے اور پھر مر جائے۔ یہ تو مقصد نہیں۔ پھر کیا اس لئے کہ انسان کو اعلیٰ مدارج اور اعلیٰ ترقیات پر پہنچایا جائے۔ اگر یہ ہے تو معلوم ہُوا کہ دُنیا کا اصل مقصد قانونِ طبعی کا اجراء نہیں بلکہ قانونِ اخلاقی کا اجراء ہے۔ دنیا کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں انسان پیدا ہو اور وہ باخدا انسان بنے۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ آسمانوں اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں عقلمندوں کے لئے بڑے نشانات ہیں۔ عقلمند وہ ہیں جو خدا کو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر یاد کرتے ہیں، اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ تب وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ اے خدا! تُو نے اس دنیا کو بغیر مقصد کے پیدا نہیں کیا۔ اب دیکھو قانونِ طبعی تو ہر ایک کو نظر آتا ہے اس کے متعلق سوچنے اور غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ سوچتے ہیں اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس دنیا کو بغیر وجہ کے پیدا نہیں کیا گیا۔ اور پھر وہ کہتے ہیں۔ اے

ہمارے رب! تُو ہمیں توفیق دے کہ ہم اس مقصد کے مطابق زندگی بسر کریں۔ وہ مقصد کیا ہے یہ کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۣ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ یعنی اے خدا! ہمیں وہ اعلیٰ درجہ کی رُوحانی اور اخلاقی ترقیات عطا کر جن کی وجہ سے انسان باخدا ہو جاتا ہے۔ اور ان باتوں سے بچا جن سے انسان خدا سے دُور ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس کے لئے کوشش شروع کر دی ہے تو توفیق دے کہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

(۲) دوسری دلیل یہ دی ہے کہ الٰہی تصرّف کے بغیر بالکل ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ روحانی اور اخلاقی قانون ملیامیٹ ہو جائے۔ کیونکہ نبی دنیا میں خدا تعالیٰ کے جلال کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ اور دنیا کو کمزور ہونے کے باوجود دکھاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا تصرف کیسا کامل ہے۔ اس وقت دُنیا کلّی طور پر قانونِ قدرت پر چل رہی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے ہر قسم کی خرابیاں پورے زور پر ہوتی ہیں۔ پس جب قانونِ قدرت کے ذریعہ زیادہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو خدا تعالیٰ نبی کے ذریعہ قانونِ اخلاق اور قانون رُوحانیت کو قائم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ دُوکشتی کرنے والوں میں سے جو اپنا ہوتا ہے اُسے غالب کرنے کے لئے سہارا دے دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح جب قانونِ قدرت قانون اخلاق کے خلاف چلنے لگتا ہے۔ اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ اپنا کوئی نبی مبعوث کر کے قانون اخلاق کو قائم کر دیتا ہے۔ پس اگر دنیا کی پیدائش کی غرض کو پورا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ الٰہی تصرف ہوتا کہ جب رُوحانی اور اخلاقی قانون کو کچلنے کے لئے کوئی زبردست فرد یا گروہ طبعی قانون سے مدد لے رہا ہو تو وہ اُس کے راستہ کو تبدیل کر دے۔ اِسی لئے فرمایا کہ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۔ مَیں نے دنیا کو رُوحانی ترقی کے لئے بنایا ہے۔ مَیں اُسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اب مشاہدہ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دُعا قبول نہیں ہوتی۔ فرمایا۔ ہر ایک دُعا خدا قبول نہیں کرتا۔ لیکن یہ نہیں کہ کوئی دُعا بھی قبول نہیں کرتا۔ اگر خدا کے تصرّف کا نمونہ دیکھنا ہو تو اس امر سے دیکھو کہ ہم کفّار کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ سامانوں کو دیکھو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس ہر قسم کے سامان موجود تھے۔ قانونِ قدرت پوری طرح اُن کی تائید میں تھا۔ مگر ہمارا قانون اخلاق چونکہ اِس سے مقدّم ہے اس لئے ہم بتاتے ہیں کہ یہ لوگ جو اپنے لشکروں اور سامانوں سے ڈراتے پھرتے ہیں خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اِن سامانوں والوں کو ہلاک کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب کر دیگا۔ ہاں فرماتا ہے کہ چونکہ طبعی قانون بھی ہمارا ہے اسلئے اس کا اعزاز بھی قائم رہنا چاہیئے اور شرعی اور اخلاقی قانون پر اعتماد کر کے اسے ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اِس میں اللہ تعالیٰ کی ہتک ہے۔ فرماتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آل عمران: ۲۰۱) اے مومنو! ہم نے دشمن کے اس اعتراض کا جواب دے دیا کہ خدا دُعا نہیں سُنتا۔ اُن کو ہم نے بتا دیا ہے کہ وہ دُعائیں سُنتا ہے۔ اور ایسے تصرّفات کریگا کہ تم باوجود سازو سامان کے جیت نہیں سکو گے اور جو تمہارے مقابلہ میں بے سروسامان ہیں وہ جیت جائیں گے۔ مگر تم بھی غلطی نہ کرنا کہ کہدو ہمیں قانونِ قدرت کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ وہ قانون بھی میرا ہی بنایا ہوا ہے۔ پس اے مومنو! صبر سے کام لینا۔ جتھہ بندی کرنا۔ ہر قسم کے سامان تیار رکھنا۔ تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

ہاں کبھی خدا تعالیٰ کا منشا یہ بھی ہوتا ہے کہ قانون قدرت کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ جیسے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھانسی کی تکلیف تھی۔ یہ کھانسی اتنی شدید تھی کہ جب اُس کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحکیم نے پیشگوئی کر دی کہ

مرزا صاحب کو سِل ہوگئی ہے اور اس بیماری سے فوت ہو جائیں گے۔ ادھر پیشگوئی شائع ہوئی اُدھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دوائی پلانے کا کام میرے سپرد تھا اور مجھے کمپونڈری کرنے کے لحاظ سے یہ خیال تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علاج کے متعلق میری ہدایات ماننی چاہئیں۔ اُن دِنوں ایک دوست آئے جو تحفہ کے طور پر کچھ پھل لائے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس وقت لیٹے ہوئے تھے۔ اور اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے آپکو کھانسی کا شدید دورہ ہو چکا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ کیا پھل ہے۔ مَیں نے عرض کیا۔ کیلے اور سنگترے ہیں اور ساتھ ہی مَیں نے عرض کیا کہ آپ نہ کھائیں کیونکہ آپ کو شدید کھانسی ہے۔ آپ نے پھل اپنے پاس رکھ لئے۔ آپ کھاتے جائیں اور مسکراتے جائیں۔ مَیں کڑھنے لگا کہ حضرت مولوی صاحب (یعنی حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ) کو کیا جواب دوں گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میری حالت دیکھ کر ہنس کر فرمایا۔ تمہیں بُرا لگتا ہے لیکن مجھے الہام ہُوا ہے کہ کھانسی دُور ہو گئی ہے۔ تو بعض مواقع پر خدا تعالیٰ ایسے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے کہ قانون قدرت کی پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بھی ایسے واقعات پائے جاتے ہیں۔ غزوہ حُنین میں جب صحابہؓ کی سواریاں بدک گئیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف ۱۲ آدمی رہ گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ذرا پیچھے ہٹ جائیں کیونکہ دشمن کا شدید حملہ ہے۔ جس صحابیؓ نے آپؐ کی سواری کے جانور کو پکڑا ہُوا تھا اُسے آپؐ نے فرمایا۔ چھوڑ دو۔ اور پھر سواری کو ایڑ لگا کر آگے بڑھے۔ اور فرمایا ؎

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

اور باوجودیکہ اُس وقت چاروں طرف سے تیر برس رہے تھے مگر آپؐ کو نہ لگے۔ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے تصرّف کے ماتحت جو اسباب پیدا ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے۔

اِس جواب میں دُعا والے اعتراض کا جواب بھی آگیا۔ یعنی خدا تعالےٰ کے طبعی اور اخلاقی قانون پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ اس لئے دُعا دونوں کے توازن کے ماتحت اور قانون کے ماتحت ہی قبول ہوتی ہے۔ اور جو اس کے خلاف چاہتا ہے وہ بیوقوف ہے۔ بہرحال اخلاقی اور رُوحانی قانون میں اندھیر نگری نہیں ہے۔

تیسری اصولی اصلاح توحید کے متعلق

تیسری اصلاح قرآن کریم نے توحید کے متعلق کی ہے۔ اِس کے متعلق پہلی خرابی یہ پیدا ہوگئی تھی کہ خدا کے مقابلہ میں اَور خدا مقرر کرنے شروع کر دیئے گئے تھے۔ یہ خرابی خواہ شرک فی الذات کی صورت میں ہو۔ جیسا کہ مسیحیوں۔ ہندوؤں اور زرتشتیوں میں ہے۔ اور خواہ شرک فی الصفات ہو جیسا کہ یہود میں ہے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے۔ ملک صدق والی سلیم کو ازلی ابدی بن ماں باپ کے مانتے تھے۔ الیاس اور کئی اَور لوگوں کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے تھے۔ اسلام نے ان سب شرکوں کو مٹایا ہے اور ایک خالص توحید قائم کی ہے۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ [1]

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر ایک کام کے لئے کافی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں وہی گھاٹے میں پڑتے ہیں۔

اِس میں چار دلیلیں ہر قسم کے شرک کے ردّ میں دی گئی ہیں (۱) فرمایا۔ تمام چیزوں کے دیکھنے سے صاف طور پر نظر آئیگا کہ وہ دو ہستیوں کی پیدا کردہ نہیں بلکہ ایک ہی ہستی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور سب کی پیدائش ایک ہی قانون کے ماتحت ہے۔ بچہ کو کسی اَور نے اور خوراک کو کسی اَور نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ بچہ پیدا ہی اس خوراک سے ہوتا ہے جو تم کھاتے ہو اور جو چیزیں کھائی جاتی ہیں ان کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ فرمایا۔ اَللّٰهُ خَالِقُ

[1] الزمر: ۶۳ تا ۶۴

كُلِّ شَيْءٍ۔ اللہ تعالیٰ کا ہر چیز کا خالق ہونا دلیل ہے اِس بات کی کہ اَور کوئی خدا نہیں ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ دی کہ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ خدا ہی سب چیزوں کا محافظ ہے یعنی سب چیزوں کی حفاظت ایک قانون کے ماتحت ہے۔ مثلاً کسی کا بیمار بیٹا اچھا ہوتا ہے تو اگر وہ یونہی اچھا ہو جاتا تو کہا جاتا کہ اس کو اچھا کرنے والا کوئی اَور ہے اور سورج چاند کو بنانے والا کوئی اَور۔ مگر اب چونکہ اچھا کرنے میں سورج چاند کا بھی دخل ہے اسلئے ماننا پڑے گا کہ جس نے سورج چاند پیدا کئے اُسی نے اچھا کیا۔

(۳) تیسری دلیل یہ دی کہ تمام ضرورتیں رُوحانی وجسمانی اُسی سے پوری ہوسکتی ہیں فرمایا لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اُسی کے ہاتھ میں ہیں جب انسان کی ساری ضروریات خواہ وہ جسمانی ہوں یا رُوحانی خدا ہی پوری کرتا ہے تو پھر عزیر یسوع اور ملک صدق وغیرہ کی ضرورت نہ رہی۔ کسی اَور خدا کی کیا ضرورت رہی کہ اُس کو معبود قرار دیا جائے۔

(۴) چوتھی دلیل یہ دی کہ خدا کی توحید کے مؤید ہمیشہ جیتتے اور دشمن ناکام ہوتے ہیں فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ جو لوگ توحید کے منکر ہوتے ہیں وہ توحید کے ماننے والوں کے مقابلہ میں ہارتے ہیں۔ یہ عملی ثبوت ہے، خدا کی توحید کا۔

پس شرک فی الذات اور شرک فی الصفات دونوں غلط ہیں۔ جہاں بعض لوگوں نے مشرکانہ خیالات سے توحید میں نقص پیدا کیا ہے۔ وہاں بعض لوگ توحید کے شوق میں وحدۃ وجود کے قائل ہو گئے اور ذرّہ ذرّہ کو خدا بنا دیا۔ قرآن کریم نے اس کی بھی تردید کی ہے۔ اِن لوگوں نے اپنی طرف سے توحید کی تائید کی تھی اور کہا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اَور وجود تسلیم کریں تو اس سے شرک لازم آتا ہے۔ مگر انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ اس طرح انہوں نے ہر چیز کو خدا قرار دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا بھی رَدّ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ فرمایا۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ

اِلَّا هُوَ ؕ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (قصص: ۸۹)

فرمایا۔ تم کہتے ہو کہ سب کچھ خدا ہی خدا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ہر وہ چیز جو پیدا ہوئی ہے ہلاک ہوتی ہے۔ اگر یہ سب کچھ خدا ہے تو تغیر پذیر نہیں ہو سکتا لیکن اسکا تغیر پذیر ہونا خود ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ خدا کا حصّہ نہیں۔ کیونکہ اگر حصّہ میں تغیر ہو سکتا ہے تو کل میں تغیّر بھی لازمی ہے۔

اِسی طرح قرآن کریم نے انسانوں پر جو لعنتیں کی ہیں اِن سے بھی وحدۃ الوجود والوں کی تردید ہوتی ہے۔ لعنت کے معنے دُور کئے جانے کے ہیں۔ اگر ہر چیز خدا کا حصّہ ہے۔ تو ایسے لوگوں کو دُور کیوں کیا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سختی کی گئی ہے۔ مگر اس طرح وحدۃ الوجود کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اگر ہم یہ مان لیں کہ ہر چیز خدا کا حصّہ ہے تو کہنا پڑیگا کہ نعوذ باللہ اس کے حصّے نہایت گندے اور ناپاک ہیں۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ اگر وحدۃ الوجود والوں کو کہیں کہ تم تو اچھے ہو۔ مگر تمہارا دل بڑا ناپاک ہے تو لڑ پڑیں گے۔ مگر خدا تعالیٰ کا جن چیزوں کو جزو قرار دیتے ہیں۔ اُن کے متعلق کہتے ہیں کہ گندی ہیں۔

بعض لوگوں نے اُن کے برعکس یہ نظریہ قائم کیا کہ دنیا کو خدا سے بالکل جُدا کر دیا اور کہدیا کہ خدا عرش پر ہے اور دنیا اس سے بالکل الگ ہے۔ وہ مخلوق سے بالکل جُدا آسمان پر قائم ہے اور وہاں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ نظریہ موحد یہود اور موحد زرتشتیوں کا ہے۔ اور بدقسمتی سے اہلحدیث کا بھی ہے۔ اسلام نے اسے بھی ردّ کیا ہے فرماتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (حدید: ۴)

یعنی اللہ ہی اوّل ہے اور اللہ ہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ عرش پر الگ تھلگ بیٹھنے والا تو اوّل۔ آخر۔ اور ظاہر۔ باطن نہیں ہو سکتا اور نہ ہر چیز کو جاننے والا ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا۔ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق آیت ۱۷) ہم انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اَب جب تک وہ سارے جسم پر تصرّف نہ کرے رگِ جان کے کس طرح قریب ہو سکتا ہے۔

غرض اسلامی تعلیم یہ ہے کہ نہ تو ہر شے خدا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام پر محصور ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہر انسان اِسے سمجھ نہ سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ہر جگہ بھی ہے اور پھر الگ بھی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب اور اعتراضوں کے جواب کے سلسلہ میں یہ دیا کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (شوریٰ:۱۲) فرمایا یہ اعتراض جہالت کا نتیجہ ہے۔ مخلوقات کے متعلق تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی نہیں ہو سکتی لیکن خدا کی تو کوئی مثل ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی ذات کو اپنی ذاتوں پر قیاس کرنا حماقت نہیں تو اَور کیا ہے۔ پس اِسے اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ جو طاقت سے بالا ہو اُس کے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ تم خدا کو سمیع کہتے ہو تو کیا یہ بھی کہتے ہو کہ اُس کے تمہاری طرح کان ہیں۔ جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا بغیر کانوں کے سُنتا ہے اور بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے اور کہتے ہو خدا کے دیکھنے اور سُننے کے متعلق ہمارا قانون نہیں چلتا تو پھر جگہ کے متعلق اپنا قانون کیوں چلاتے ہو۔ پس جو ہستی تم سے بالا ہے اُس کے سمجھنے کی کوشش فضول ہے۔ فرماتا ہے۔ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل:۳۷) یعنی اے مخاطب جس بات کا تجھے علم نہ ہو اُس کی اتباع ہرگز نہ کیا کر۔ کیونکہ کان اور آنکھ اور دل اِن سب کے متعلق تجھ سے پوچھا جائیگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ صرف آنکھ اور کان کا تجسس ہوتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دل بھی تجسس کرے گا تو پکڑا جائیگا۔ درحقیقت یہ ضروری نہیں کہ کسی چیز کے سمجھنے کے لئے اُس کی کُنہ بھی سمجھی جائے۔ انسان سمجھ اُسی قدر سکتا ہے جس قدر سمجھنے کی اس میں طاقت ہو۔ انسان کا علم

دُوقسم کا ہوتا ہے بعض چیزوں کے خالی وجود کا اُسے علم ہوتا ہے۔ مگر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح ہیں اور بعض چیزوں کے متعلق پتہ ہوتا ہے کہ کس طرح ہیں اور اُن کی کیا حقیقت ہے۔ پھر بعض کے متعلق اُس کے منبع تک کا علم ہوتا ہے۔ غرض جس جس قدر اس کا ادراک چل سکتا ہے اُسی قدر وہ بھی چل سکتا ہے۔ مگر فرمایا وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (بقرہ:۲۵۶) اللہ تعالیٰ کے متعلق جس قدر سمجھنے کی خدا تعالیٰ نے تمہیں طاقت دی ہے اُتنا ہی تم سمجھ سکتے ہو۔ اس سے آگے بڑھو گے تو ٹھوکریں کھاؤ گے۔

چوتھی اصلاح۔ خدا تعالیٰ اور بندے کا تعلق

چوتھی اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا اور بندہ کے تعلق کی کی ہے اس بارہ میں ایک وسوسہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندہ کی ہدایت کے لئے کوئی کلام نہیں اُتارا۔ خود ہی انسان تجربہ سے اپنے لئے ایک راہ تجویز کر لیتا ہے۔ فلاسفر وغیرہ کہ خدا کے قائل ہیں لیکن الہام و شریعت کے نہیں اُن کا یہی نظریہ ہے۔ قرآن کریم اسے رد کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ۔ یاد رکھو رُوحانی معاملات میں آپ ہی رستہ نہیں بنایا جا سکتا صرف اللہ ہی یہ رستہ دکھا سکتا ہے۔ آگے اس کی وجہ بیان کرتا ہے۔ فرماتا ہے:۔ وَلَهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (انعام:۷۴) اُس کی بات ہو کر رہنے والی ہے۔ اور جس دن صور پھونکا جائیگا حکومت صرف اُسی کو حاصل ہوگی۔ وہ پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہر کو بھی جانتا ہے وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔

اِس آیت میں مندرجہ ذیل دلائل دیئے گئے ہیں:۔

اوّل یہ کہ خدا کا کلام غلطی سے پاک ہوتا ہے اور ہدایت کے لئے غلطی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ دنیوی امور کے متعلق تو ہو سکتا ہے کہ ایک غلط بات بھی مان لی جائے اور اس کا کچھ نقصان نہ ہو۔ مثلاً باپ دادا پانی کو مفرد مانتے آئے تو اس سے کوئی نقصان نہ ہوا۔ لیکن اگر خدا تعالیٰ

کے متعلق غلطی کی جائے اور خدا کو ایک نہ مانیں تو اس کا نتیجہ جہنم ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ رُوحانی ہدایت خدا ہی دے۔ تاکہ وہ غلطی سے پاک ہو نہ کہ تجربہ سے حاصل کی جائے۔

دوم۔ جس مقصد کے لئے کلامِ الٰہی کی ضرورت ہے یعنی مابعد الموت ترقیاتِ رُوحانی ان کے اسرار خدا تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔ پس اس منزل کے لئے جس کا علم انسان کو نہیں وہ کیونکر اپنے لئے قوانین بنا سکتا ہے؟ چونکہ اس دنیا میں جو تم عمل کرتے ہو اُس کی غرض ابدی زندگی میں ایسی طاقت کا حاصل ہونا ہے جس سے کہ وہاں کام کر سکو۔ اور تمہیں پتہ ہی نہیں کہ اگلے جہان کی کیا حالت ہے تو اُس کے لئے سامان کس طرح مہیا کر سکتے ہو۔ اُس ملک پر صرف خدا کا تصرف ہے اس لئے خدا ہی اس کے متعلق سامان کی تیاری کرا سکتا ہے۔

سوم۔ یہ کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ ظاہری اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اگلے جہان کو جانے دو۔ اسی جہان کو دیکھ لو۔ تمہاری فطرت میں بڑی بڑی طاقتیں ہیں مگر انسان خود اُن کو نہیں جانتا۔ یہ سب باتیں خدا ہی جانتا ہے۔ اس لئے ترقی کے سامان بھی وہی کر سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔

چہارم یہ کہ وہ علیم وخبیر ہے۔ جہاں اُسے انسانی طاقتوں کا علم ہے وہاں وہ انسانی کمزوریوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ اس لئے فرماتا ہے چونکہ ہم ہی جانتے ہیں کہ کیا کیا طریق تمہیں بتانے چاہئیں۔ اس لئے ہم ہی سامان پیدا کرتے ہیں کیونکہ حکیم اور خبیر ہستی ہی قواعد تجویز کر سکتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ رُوحانی راہنما کے لئے طبیب ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ ممکن ہے وہ دوسروں کو ایسی باتیں بتائے جو انسانی صحت کیلئے سخت مضر ہوں۔

دوسرا وسوسہ خدا تعالیٰ کے کلام کے متعلق یہ تھا کہ کہتے تھے کہ خدا کلام تو اتارتا ہے مگر الفاظ میں نہیں بلکہ دل میں خیال پیدا کر دیتا ہے۔ آج کل یہ غلطی برہمو سماج کو لگی ہوئی ہے۔ بلکہ عیسائیوں۔ یہودیوں اور ہندوؤں کو بھی لگی ہوئی ہے۔ یہ کہتے ہیں۔ کیا خدا کا منہ اور زبان ہے کہ وہ الفاظ بولتا ہے؟ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خدا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے

جس طرح وہ بے کان کے سُنتا ہے۔ بے آنکھ کے دیکھتا ہے۔ اسی طرح بے زبان کے کلام بھی کر سکتا ہے اور یہ معترض خدا تعالیٰ کے دیکھنے اور سُننے کی طاقت کو تسلیم کرتے ہیں پھر اعتراض کیسا۔ یہ الزامی جواب ہے۔ حقیقی جواب یہ دیا کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۖ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ (انعام:۹۲) فرمایا۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی طاقتوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ جب انہوں نے یہ بات کہی کہ کسی بندہ پر اُس نے کلام نازل نہیں کیا۔ اگر نہیں نازل کیا تو موسیٰؑ پر کس نے کتاب نازل کی تھی جس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہوں نے کچھ چھپائے اور کچھ ظاہر کئے۔ پھر وہ کون ایسی باتیں سکھاتا ہے تو ان کے باپ دادے بھی نہیں جانتے تھے۔ کہو۔ اللہ ہی سکھاتا ہے۔ پھر اُن کو چھوڑ دے تاکہ لغو باتوں میں لگے رہیں۔

یہ منکرینِ کلام کا ردّ کیا گیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کی مثال دی گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال تھا کہ اور نبیوں سے تو رؤیا وغیرہ کے ذریعہ سے کلام ہوا ہے یا وحی خفی قلبی سے لیکن حضرت موسیٰؑ سے کلام الفاظ میں ہوا۔ چنانچہ گنتی باب ۱۲ آیت ۱ و ۲ میں لکھا ہے کہ ہارون اور مریم نے شکوہ کیا کہ موسیٰ نے کوشی عورت سے کیوں شادی کی۔ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ حالانکہ خدا جس طرح اس سے باتیں کرتا ہے ہم سے بھی کرتا ہے۔ اس پر خداوند ناراض ہوا اور انہیں موسیٰ سمیت بلوایا۔ اور کہا۔ "میری باتیں سنو۔ اگر تم میں سے کوئی نبی ہوتا تو میں جو خداوند ہوں اپنے تئیں رؤیا میں اسے معلوم کرواتا۔ اور اس سے خواب میں باتیں کرتا۔ پر میرا بندہ موسےٰ ایسا نہیں ہے کہ وہ میرے سارے گھر میں امانت دار ہے۔ میں اس سے آمنے سامنے صریح باتیں کرتا ہوں اور نہ کہ پوشیدہ باتیں۔" (گنتی باب ۱۲ آیت ۶ تا ۸)

بنی اسرائیل کے نزدیک اس قسم کا کلام حضرت موسیٰؑ سے پہلے نبیوں کی نسبت سے ہی نہیں ہوا بلکہ بعد میں بھی جو نبی آئے اُن سے بھی یہود فرق کیا جاتا۔ چنانچہ استثنا باب ۳۴ میں حضرت

موسیٰؑ کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے :-

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰؑ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا۔ جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔" (آیت ۱۰)

قرآن کریم نے بھی حضرت موسیٰؑ کا کچھ امتیاز تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں نبیوں کے ذکر میں آتا ہے۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء: ۱۶۵) اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے خوب اچھی طرح کلام کیا۔ تَكْلِيْمًا آمنے سامنے کلام کرنے کو کہتے ہیں۔ بائیبل میں بھی عام طور پر نبیوں کی رؤیا بیان ہوئی ہیں۔ اس سے آہستہ آہستہ یہود میں بھی جیسا کہ مسلمانوں میں سے بعض میں ہوا یہ خیال پیدا ہو گیا کہ الہام قلبی ہوتا ہے نہ کہ لفظی۔ مسیحی آج تک اس خیال کی بنا پر قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ موسیٰؑ پر لفظی الہام نازل ہوا۔ پس اللہ تعالےٰ نے انہیں کہا کہ باقی نبیوں کو چھوڑو۔ موسیٰ کی نسبت الفاظ میں وحی کا دعویٰ موجود ہے یا نہیں اور جو حضرت موسیٰؑ کو ماننے والے نہیں ہیں جیسے ہندو اور برہمو سماج والے اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ۔ تم قلبی وحیاں کہتے ہو یہ تو شروع سے چلی ہی آتی ہیں مگر کیا کوئی ایسی وحی ہے جو اس علم کو بیان کرے جو قرآن کریم میں ہے۔ پس اگر باوجود اپنے قلبی القاؤں کے تم قرآنی علوم سے بے بہرہ رہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم نے وہ وہ باتیں سکھا دیں جو تمہارے باپ دادوں کو بھی معلوم نہ تھیں تو تم کس طرح حقیقی الہام کی افضلیت اور ضرورت کا انکار کر سکتے ہو۔

پانچویں اصولی اصلاح خدا تعالیٰ کی خالقیت کے متعلق

پانچویں اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا تعالےٰ کی صفت خالقیت کے متعلق کی۔ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو تو مانتے ہیں۔ لیکن اُسے خالق تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ رُوح اور مادہ آپ ہی آپ پیدا ہو گئے۔ بعض فلاسفروں اور ہندوؤں کا بھی یہی خیال ہے۔ جیسا کہ آریہ کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے اِسے ردّ کیا ہے اور اس کی تردید میں دلیلیں دی ہیں۔ فرمایا۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (ذاریات:۵۰) یہ خیال کہ رُوح اور مادہ اپنے طور پر ہی چلے آتے ہیں بالکل غلط ہے۔ ہم نے کسی چیز کو مفرد پیدا نہیں کیا بلکہ ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے۔ چنانچہ تم دنیا کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ لو تمہیں کوئی چیز مفرد نظر نہیں آئے گی۔ سب مرکّبات ہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ ہر چیز جہات رکھتی ہے۔ رنگ رکھتی ہے۔ قوام رکھتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے مفردات کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ مرکّبات کو پیدا کیا ہے تو یہ کہنا کہ مادہ ازل سے ہے کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ سائنس نے بھی اسی کی تائید کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام چیزوں کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔

(۲) پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (قصص:۸۹) یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہی خدا ہے۔ اور ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ سوائے اس کے جس پر خدا کی توجہ ہو گئی۔ تم سب اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یہاں بتایا کہ ہر چیز تباہ ہو رہی ہے۔ کوئی ایسی چیز دکھاؤ جو مٹتی نہیں۔ جن چیزوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ تباہ نہیں ہوتیں۔ اُن کے متعلق اب معلوم ہو گیا ہے کہ وہ بھی تباہ ہو رہی ہیں۔ اور جن کو اب سمجھتے ہیں کہ تباہ نہیں ہو رہیں ان کے متعلق آئندہ سمجھ لیں گے کہ وہ بھی تباہ ہو رہی ہیں۔ پس ہلاکت بھی ثابت کرتی ہے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں قائم نہیں۔ پھر فرمایا۔ خدا ہر چیز کا حاکم ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب اس نے رُوح اور مادہ کو پیدا ہی نہیں کیا، تو ان کے ذریعہ جو چیزیں بنتی ہیں یا بنی ہوئی ہیں اُن کا وہ حاکم کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا تم یہ مانتے ہو یا نہیں کہ خدا رُوح اور مادہ پر حکومت کرتا ہے۔ اگر یہ مانتے ہو تو کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسی ہستی جو ظالم نہیں ہے بلا وجہ اُن پر حکومت کر رہی ہے حالانکہ اُن کے پیدا کرنے میں اُس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ غرض ہر چیز کا جوڑے کی صورت میں ہونا ان کے نقص پر اور ہلاکت اُن کے مخلوق ہونے پر دلالت کرتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حکومت اور اس کی طرف رجوع اُسکے خالق ہونے کا ثبوت ہے

چھٹی اصولی اصلاح اللہ تعالیٰ کی مالکیت کے متعلق

چھٹی اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی صفت مالکیت کے متعلق

کی ہے۔ اِس کے بارے میں دو نقص پیدا ہو گئے تھے۔ جن میں سے ایک تناسخ کا عقیدہ ہے جو بڑی شدّت سے اختیار کر لیا گیا۔ اور کہا جانے لگا کہ دنیا میں بعض انسان ادنیٰ اور ذلیل حالت میں ہیں اور بعض اچھی حالت میں ہیں یہ فرق ان کے پچھلے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اِسی طرح بعض سُکھ میں ہیں اور بعض دُکھ میں یہ بھی گذشتہ اعمال کی پاداش میں ہے۔ اِسی طرح کُتّے بلّی بیل اور انسان کا فرق کیوں ہے! یہ بھی گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے یہ بات غلط ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (المؤمنون: ۱۰۰ و ۱۰۱) جب کافر مرنے لگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں۔ خدایا ہمیں پھر دنیا میں واپس لوٹا دے تاکہ ہم جو کچھ چھوڑ آئے ہیں وہ جاکر تیرے راستہ میں لٹا دیں۔ اور نیک اعمال کریں۔ فرمایا یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف ایک کلمہ ہے جو اُن کی زبان سے نکل رہا ہے۔ کیونکہ مجرم جب سوچتا ہے کہ میں جہنم میں گیا تو کیا ہوگا تو وہ گھبرا کر کہتا ہے کہ مجھے واپس لوٹا دو۔ اِسی خیال کے ماتحت تناسخ کا عقیدہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں خواہش ایجاد کی ماں ہے۔ تناسخ کا عقیدہ اس گھبراہٹ سے پیدا ہوا ہے کہ اگر بدعمل مرے تو پھر کیا کرینگے۔ درحقیقت یہ جاہل مجرم دماغ کی اختراع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایک بات ہے جو اپنے ماحول میں مجرم رُوح کہے گی۔ اور یہ اُس کی ایک طبعی خواہش ہے مگر یہ پوری نہیں کی جا سکتی۔ کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اِس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے کہ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (انعام: ۱۳) یعنی تو ان سے پوچھ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے اور کون اس کا مالک ہے۔ اس کا جواب وہ کیا دینگے۔ تو خود ہی ان سے کہہ دے کہ اللہ ہی اِسکا

مالک ہے۔ اُس نے اپنے نفس پر رحمت فرض کر لی ہے۔ اور اُس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تناسخ کے چکر میں رُوحوں کو نہیں ڈالے گا۔ بلکہ وہ تم کو قیامت کے دن تک جمع کرتا چلا جائیگا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے۔ وہ اپنی بداعمالی کی وجہ سے اس قیامت کے مسئلہ پر یقین نہیں لاتے۔ لَيَجْمَعَنَّكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تناسخ کا رد کیا گیا ہے کیونکہ فرمایا نہیں ہم قیامت تک رکھیں گے اور لوٹائیں گے نہیں۔

اِس میں دلیل یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے اور مالک کا اختیار ہے کہ جس چیز کو جس مقام پر چاہے رکھے۔ کیا مالک کو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اِس چمڑے کی جوتی کیوں بنائی پیٹی کیوں نہیں بنائی۔ یا یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کے لٹھے کے ایک ٹکڑے کا پاجامہ اور دوسرے کا کُرتا کیوں بنایا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ تم جو کہتے ہو یہ ظلم ہو گیا کہ ایک کو امیر اور دوسرے کو غریب بنایا۔ تم بتاؤ کہ مَیں ہر چیز کا مالک ہوں یا نہیں۔ اگر مالک ہوں تو مَیں نے جو کام کسی کے سپرد کیا۔ وہی ٹھیک ہے۔

اِس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ پھر اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ خدا جسے چاہے بہشت میں بھیج دے اور جسے چاہے دوزخ میں ڈال دے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مجھے حق حاصل ہے مگر مَیں نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ مَیں ایسا نہیں کرونگا چنانچہ فرمایا كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اُس نے اپنی جان پر رحمت فرض کر لی ہے۔ اور اِس وجہ سے باوجود مالک ہونے کے کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ اور یہی سبب ہے کہ وہ مُردوں کو اس دنیا میں واپس نہیں کرتا بلکہ اُس نے فیصلہ کا دن یوم قیامت اور فیصلہ کا طریق دوسرا مقرر کیا ہے۔ اور جب ہم غور کرتے ہیں تو واقعہ میں تناسخ رحم کے خلاف اور محشر رحم کے مطابق نظر آتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح تناسخ کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے رحم میں فرق آتا ہے۔ تناسخ کی غرض اصلاح بتائی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اِس چکر میں پڑنے سے رُوح کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ مگر انسانی اصلاح حقیقت کے علم سے ہوتی ہے۔ جہالت سے نہیں ہو سکتی۔ اب

غور کرو۔ تناسخ کے رو سے انسان کو کوئی حیوان یا پرندہ یا درندہ بنا دینے سے اس کے لئے اصلاح میں آسانی پیدا کرنا ہے یا مشکل۔ انسان کو خدا نے عقل دی۔ دولت دی۔ بھلائی برائی کی سمجھ دی بدیوں سے بچنے کی طاقت دی مگر اس نے گناہ کیا۔ اس پر اُسے بے عقل اور بے وقوف حیوان بنا دیا اور اس طرح اس کے لئے نیکی کرنا اور زیادہ ناممکن کر دیا گیا۔ پس انسان کو انسانیت کی بجائے ادنیٰ حالت میں لے جانا خدا کی رحمت کے بالکل خلاف ہے اور اصلاح سے اُسے دُور کرنا ہے۔ اور اگر انسان ہی بنا کر دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو بھی دو حالتیں ہونگی۔ وہ پہلی زندگی سے واقف ہوگا یا ناواقف۔ اگر واقف ہوگا تو اخفا باقی نہ رہا۔ پھر نجات کوئی معنے نہیں رکھتی۔ کیونکہ اُس پر حقیقت کھل گئی۔ کہ اس وجہ سے مجھے سزا دی گئی تھی اور اگر ناواقف ہوگا تو پھر اصلاح کس طرح کر سکیگا۔ ساری عمر اسی چکّر میں پڑا رہیگا۔ اور ممکن ہے کہ بجائے نیکی کرنے کے بدی میں اور بڑھ جائے۔

پس رحمت کا طریق وہی ہے جو اسلام نے مقرر کیا ہے اور جو یہ ہے کہ جو نیکیاں کر چکا۔ اگلے جہان میں اُن نیکیوں کو بڑھنے کا موقع دیا جائے اور جو گناہ کر چکا اُس کے زنگ کو جہنم میں دُور کیا جائے تاکہ کم از کم اُس کی آئندہ نجات کی صورت تو پیدا ہو جائے جونوں کے چکّر میں تو نہ پڑا رہے۔

دوسری چیز جس کی وجہ سے مالکیت کی صفت کے متعلق لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے وہ کفارہ ہے۔ یہ غلطی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی صفت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ نصاریٰ نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ گناہگار کو بخش دے تو یہ ظلم ہوگا۔ اور وہ کہتے ہیں خدا تعالیٰ چونکہ کسی کا گناہ بخش نہیں سکتا اس لئے اُس نے اپنے بیٹے کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے گناہ کے بدلے پھانسی پائے۔ یہ خیال بھی مالکیت کی صفت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کیونکہ مالک تو جسے چاہے بخش سکتا ہے۔ وہی نہیں بخش سکتا جو مالک نہ ہو۔ ہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام نے تسلیم کیا ہے کہ خدا تعالیٰ بعض گناہ نہ بخشے گا۔

لیکن مالکیت کے ماتحت اس کا بھی علاج ہو جاتا ہے۔ فرماتا ہے۔ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (آل عمران آیت ۱۹۶) یعنی وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور میری راہ میں تکلیف دی گئی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے جنگ کی اور مارے گئے۔ اُن کی بدیوں کے اثر کو اُن سے یقیناً مٹا دوں گا اور جو دوسرے کا قرضہ ان کے ذمہ ہو گا وہ اپنی طرف سے ادا کر دونگا۔ اِس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ اُن کی طرف سے ہم آپ کفارہ دے دینگے۔ اس کفارہ اور عیسائیوں کے کفارہ میں ایک فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ عیسائی کہتے ہیں کہ خدا چونکہ معاف نہیں کر سکتا۔ اس لئے اُس نے اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔ اسلام کہتا ہے خدا تعالیٰ مالک ہے وہ معاف کر سکتا ہے۔ لیکن وہ کسی دوسرے کا حق ضائع نہیں کرتا خود اجر دے دیتا ہے۔

ساتویں اصولی اصلاح خدا تعالیٰ کی ربوبیت عالمین کے متعلق

ساتویں اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت عالمین کے متعلق کی ہے۔ ہر قوم نے خدا تعالیٰ کی ربّ العالمین کی صفت کا انکار کر رکھا تھا۔ اور ہدایت کو صرف اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔ حتّٰی کہ مسیحیت جو تبلیغی مذہب ہے اُس نے گو آئندہ کے لئے دروازہ کھولا تھا مگر گذشتہ کے متعلق وہ بھی یہودی مذہب سے ہی ہدایت وابستہ قرار دیتی تھی۔ قرآن کریم نے آئندہ کے لئے تو یہ اعلان کیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف ۱۵۹) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو لوگوں سے کہدے کہ مَیں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ اور گذشتہ کے متعلق فرمایا۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۲۵) ہر قوم میں خدا کے نبی آتے رہے ہیں

(۲) دوسرے بعض قوموں کو بعض پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ایک قوم کو معزز قرار دیا جاتا تھا اور دوسری کو ذلیل ٹھہرایا جاتا۔ چنانچہ ہندوؤں نے برہمن اور شودر کی تقسیم کے ذریعہ

اور یہود نے کہانت کو بنی لاوی میں مخصوص کر کے مساوات کو مٹا رکھا تھا۔ اسی طرح بعض قوموں نے بادشاہت کی وجہ سے اپنے آپ کو فضیلت کا حقدار قرار دیا۔ اسلام نے اسے بھی رب العالمین کی صفت کے خلاف قرار دیا اور فرمایا۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (حجرات: ۱۴) کہ اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو کئی گروہوں اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض لوگ بڑے اور بعض چھوٹے ہیں۔ بلکہ یہ قومیں محض جاننے اور پہچاننے کے لئے بنائی گئی ہیں تاکہ تم میں امتیاز قائم رہے۔ ورنہ تم میں اگر کوئی معزز ہے تو وہی جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔ اور اللہ یقیناً بہت علم رکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کون تقویٰ سے کام لے رہا ہے۔ اور کون تکبّر اور تفاخر کی راہ اختیار کر رہا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمدنی برتری کی وجہ سے دوسروں کو حقیر قرار دینا ناجائز قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اصل فضیلت تقویٰ میں ہے۔ ذات پات اور قومیت کی قیود میں نہیں۔

پھر سیاسی برتری کو بھی اُس نے ردّ کیا اور فرمایا۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (قصص: ۵) یعنی فرعون نے اپنے ملک میں بڑی تعلّی سے کام لیا۔ اور اُس کے رہنے والوں کو اُس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ بعض کو کہتا کہ یہ حاکم قوم کے لوگ ہیں اور دوسروں کے متعلق کہتا کہ وہ محکوم قوم کے لوگ ہیں۔ اُس نے بہت بڑے تکبّر سے کام لیا اور وہ مفسدین میں سے تھا۔ ہم نے اس قسم کا کوئی قانون نہیں بنایا کہ کوئی قوم ہمیشہ کے لئے حاکم ہو۔ اور کوئی قوم ہمیشہ کے لئے محکوم ہو۔ جیسے انگریز ہیں ویسے ہی دوسرے لوگ ہیں۔ انگریزوں کو کوئی حق نہیں کہ وہ کہیں ہم ہمیشہ کے لئے حاکم ہیں اور دوسرے ہمیشہ کے لئے محکوم ہیں۔

آٹھویں اصولی اصلاح اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم کے متعلق

آٹھویں اصولی اصلاح

قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم کے متعلق کی۔ قرآن کریم سے پہلے قریباً ہر مذہب میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ گویا اس دنیا کی پیدائش کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو مکتی کے قائل تھے۔ بدھ نروانا کے قائل تھے۔ یہود حکومتوں اور بادشاہتوں کے ملنے کے۔ نصاریٰ موت سے نجات اور امن کے۔ زرتشتی جنت کے۔ مگر باوجود اس کے ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے دنیا کی پیدائش کا مقصد کہا جا سکے۔ سب محدود مقاصد ہیں جو پیدائش کی حقیقت کو نہیں کھولتے۔ قرآن کریم نے اس سوال کو بھی حل کر دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ پیدائش عالم کا مقصد یہ ہے کہ انسان جو عالمِ صغیر ہے عرفانِ الٰہی کو حاصل کرے جسے دوسرے لفظوں میں لقا بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی چیز اپنے اندر ہوتی ہے تبھی انسان اُسے پہچان سکتا ہے مثلاً زید بکر کو پہچانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بکر کی تصویر زید کے اندر ہے ورنہ وہ اُسے پہچان نہیں سکتا۔ پس عرفان کے معنے ہیں اللہ اپنے بندے کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک ہندو تو کہتا ہے کہ بندہ خدا میں داخل ہو گیا۔ مگر اس طرح تو انسان کی کوئی حس ہی باقی نہ رہی۔ پھر اُسے مزا کیا آیا۔ مثلاً ایک گاجر آدمی نے کھالی تو گاجر کو کیا لطف آیا۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ خدا بندہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اس کی حس قائم رکھتا ہے۔ اور اسلام بتاتا ہے کہ یہ مقصد کسی خاص انسان کے لئے نہیں بلکہ ہر فردِ بشر کو اس مقام تک پہنچایا جائیگا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (ذاریات: ۵۷) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ تذلل کے لئے پیدا کیا ہے۔ تاکہ وہ میرے نقش کو لے لیں۔ اور میری صفات کو اپنے اندر داخل کر لیں۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ بات یعنی خدا تعالیٰ کی لقا کا مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے لئے فرمایا۔ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ

كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ (اعراف: ۱۵۷) یعنی میں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اُسے ہمیشہ عذاب میں رکھوں گا۔ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے اور اس کے لئے بھی میں نے رحمت پیدا کی ہے مگر مومنوں کے لئے تو اُسے فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ مومن جو تقویٰ اختیار کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

غرض بنی نوع انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ خواہ کوئی ہو۔ یہودی ہو۔ نصرانی ہو۔ ہندو ہو یا مسلمان ہو جلد یا بدیر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر کے اس کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرے اور یہ وہ مقصد ہے کہ جس میں دنیا کی کوئی قوم اسلام کی شریک نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو صرف اِس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اُس کے جلال کا مظہر بنے۔ اور اس غرض کے لئے خدا تعالیٰ نے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔ اِسی طرح ابوجہل کو پیدا کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو سیدھا رستہ اختیار کر کے اس مقصد کو پا لیا اور ابوجہل کو مار پیٹ کر اس مقصد کی طرف لایا جائیگا۔ بہرحال اس مقصد کے حاصل کرنے میں جو آگے ہوگا وہ آگے ہی رہیگا۔ اور جو پیچھے چلے گا وہ پیچھے ہی رہے گا +